ایک ٹکڑا دھوپ کا

غزال ضیغم

ایک ٹکڑا دھوپ کا

غزال ضیغم

یہ کتاب اتر پردیش اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی
اس کتاب کے مندرجات سے اکادمی کا متفق ہونا ضروری نہیں

EK TUKDA DHOOP KA (Afsane) 2000
By. Ghazal Zaigham Rs. 125/-

ایک ٹکڑا دھوپ کا

(افسانے)

غزال ضیغم

تقسیم کار

نرالی دُنیا پبلیکیشنز

A-358، بازار دہلی گیٹ، دریا گنج، نئی دہلی - 110002

فون: 011-3276094

سن اشاعت : ۲۰۰۰ء
تعداد : ۵۰۰
قیمت : ایک سو پچیس روپے

ناشر : غزال ضیغم ،68- آفیسرس ہائسٹل ، میرا بائی مارگ ،لکھنؤ-226001

کمپوزنگ : نعمت کمپوزنگ ہاؤس ، دہلی
طباعت : ایم۔ آر۔ آفسیٹ پرنٹرز ، نئی دہلی

زیرِ اہتمام
تنویر احمد

ملنے کے پتے :

- نرالی دنیا پبلی کیشنز A-358، بازار دہلی گیٹ ، دریا گنج ، نئی دہلی-110002
- موڈرن پبلشنگ ہاؤس ،9- گولا مارکیٹ ، دریا گنج ، نئی دہلی-110002
- ماہنامہ ادبی اردو چینل ،7/3121- گجانن کالونی ، گوونڈی ، ممبئی-400043
- نیا سفر ،68- مرزا غالب روڈ ، الہ آباد-3
- نصرت پبلشرز ، امین آباد ، لکھنؤ-3

انتساب

اپنی پہلی ادبی کاوش

اپنی زندگی کے روشن منارے

ابو (مرحوم ضیغم علی خان)

باجی (شمع ظفر مہدی)

اور

دولھا بھائی (ظفر مہدی)

کے نام

ترتیب

بھُولے بسرے لوگ

ذہن میں ہزاروں کیمرے ایک ساتھ چلنے لگتے۔ کلک...... کلک کلک......

لانگ شاٹ...... صحن، دریچے، صحنچی، سہہ درا، دالان، طویل سیلا ہوا غسل خانہ، جہاں دن میں بھی اندھیرا رہتا تھا۔ چُنا ہوا روشندان، الگنی پہ ٹنگے میلے کپڑوں کا ڈھیر، یخ پانی سے لبالب دیگ، سنگ مرمر کی چوکی، گھڑے، گھڑونچی، جھانوے، لوٹے، ابٹن، بیسن دانی، ریٹھوں آنولوں سے بھیگی کڑھائی، دیمک لگا ہلتا دروازہ......

کلوز اَپ...... ناون، اماں کا سر دھلوا رہی ہیں۔ ان کے لمبے سیاہ بال لگن میں کنڈلی مارے لہلہا رہے ہیں۔ پیروں میں جھاواں کر رہی ہیں۔ اماں سر جھکائے بیٹھی ہیں۔

مڈکلوز اَپ...... باورچی خانے میں تام چینی کی رکابی میں چھ چھ روٹی کے جوڑے لگائے جارہے ہیں۔ پیالوں میں آلو گوشت کا قلیہ بوٹیاں گن کے ڈالا جارہا ہے۔ ہرواہوں کے لیے اماں سیدھا تولا رہی ہیں۔ ایک سیر چاول، آدھا سیر دال، ایک سیر آٹا، نمک کی ڈلی، لال مرچ ڈال کرانگوچھے بندھ رہے ہیں۔

کیمرے نے اب ٹلٹنگ (Tilting) شروع کردی۔ اُوپر نیچے نیچے اوپر نشیب و فراز...... نشیب و فراز سارے شاٹ سپر امپوز۔ سب کچھ آپس میں گڈ مڈ......

یا اللہ...... حسن نے اپنا سر تھام لیا۔

انسان زندگی کی پیہم تبدیلیوں کا عادی ہوتا چلا جاتا ہے، ورنہ مر جائے۔ حسن نے سوچا۔ لیکن نہ تو اس کا شمار زندوں میں تھا نہ مُردوں میں۔ وہ جب سے کراچی آیا

تھا چین کی نیند ایک رات بھی نہیں سو پایا تھا۔ شاہانہ آرام دہ خواب گاہ میں وسیع و عریض چھپر کھٹ پر کروٹیں بدلتے بدلتے چھت سے لٹکے ہوئے بلوریں فانوس کو تکتے تکتے صبح ہو جاتی......

شہلا اکثر چڑ کے کہہ بھی دیتی ''کیا پاگلوں کی طرح رات رات بھر کروٹیں بدلتے رہتے ہو...... ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھاتے؟''

''میرا درد لادوا ہے......'' وہ تلخی سے ہنس دیتا۔

اس کے چہرے کی رنگت سیاہ ہوتی جا رہی تھی۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے۔ بالوں کا رنگ فاختئی...... آنکھوں کی چمک مدھم...... نیند کی گولیاں...... سب بیکار ثابت ہوتیں۔ جڑوں سے کٹنا بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے......

برسوں بیت جاتے ہیں کسک دل میں رہتی ہے۔

عیش و عشرت...... ایرکنڈیشنڈ گاڑیاں، شاندار وِلا، عزّت، شہرت، حسین و جمیل بیوی شہلا، بھاری بینک بیلنس، بہترین لباس، خدمت کے لیے نوکروں کی پلٹن موجود۔ لیکن دل کم بخت دل...... جانے کیوں ابھی بھی ہندوستان کے ایک چھوٹے سے شہر سلطان پور میں بسا تھا۔

کھانا کھاتے وقت حلق میں نوالے اٹک جاتے۔ وہ بار بار پانی پیتا۔ شہلا ٹوکتی، اماں ڈانٹتیں ''زیادہ پانی نہ پی...... بھوک مر جاتی ہے......''

جھماجھم ساون برستا...... ندی نالے اُبل پڑتے۔ کچے صحن میں گھٹنوں گھٹنوں پانی بھر جاتا۔ باغ میں آم کے پیڑ پہ نیا تختہ ڈالا جاتا۔ بجیا کجری گاتیں۔ مہارت سے ست رنگی چنریاں رنگی جاتیں۔

اماں باورچی خانے سے نکل کر باہر چھپرّ میں بیٹھ کر بیسن بھرے پراٹھے پکاتیں۔ ''بھیا آؤ...... گرم گرم کھائے لیو......''

''سر لنچ از سروڈ'' دست بستہ مؤدب بیرے میز پر احترام سے جھک کر چاندی کی قابوں میں کھانا پیش کرتے...... (ذائقہ...... نامعلوم) ڈائننگ ہال میں سفید براق کھڑکھڑاتے نیپکن...... میز پر چھری کانٹے جگمگاتے (کوئی ہنسی کوئی قہقہہ نہیں) کانوں

سے کھانے کے ٹکڑے پلکوں کی طرح اٹھائے جاتے۔ نیپکن ہونٹوں سے مس ہوتے......

صبح وہ دیر تک پڑا سوتا رہتا۔ شہلا بھی سوتی رہتی۔ کچھ دنوں سے اس نے اپنا بیڈروم الگ کر لیا تھا۔ شہلا بھی کیوں اس کی وجہ سے اپنی نیند خراب کرے۔ اسے تو رت جگوں کی عادت ہوگئی تھی۔ گاؤں میں لماں صبح صبح کمرے میں آتی تھیں۔ چپ چاپ کھڑی اسے دیکھتی رہتیں۔ بند آنکھوں سے وہ جان لیتا کہ لماں ہیں آس پاس ایک نرم گرم سا احساس...... ایک خوشبو......

چپکے سے پیروں کی چادر برابر کرتیں۔ کھڑکی کا پردہ ٹھیک کرتیں۔ دھوپ اندر نہ آسکے اس لیے اور دروازہ آہستہ سے بھیڑ دیتیں۔

نوکرانی سے کہتیں۔ ”بھیا کا کمرہ چھوڑ دینا...... جب اٹھے گا تو میں جھاڑو لگادوں گی۔“

شہلا عاجز ہے۔ لیکن اسٹیٹس جانتی ہے۔ خود اس نے جان بوجھ کر شادی کی تھی۔ وہ تیار نہیں تھا۔ وہ تیار تھی بلکہ بضد تھی۔ بیشمار دولت...... اعلیٰ ترین سوسائٹی میں شامل ہونے کا شوق۔

”سب کچھ تو ہے؟“

”لیکن......“ وہ چپ ہو جاتا تھا۔

اس گھٹن سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے، اس نے سوچا۔

چلو ایک بار ہندوستان ہو ہی آئیں۔

بارہ سال کی عمر میں پھوپھا اسے یہاں لے آئے تھے۔ پھوپھی لاولد تھیں۔ ابا سے اُسے مانگ لائیں۔ ابا کے کالے کلوٹے سوکھے چمرخ نو نو بچے، دن بہ دن بڑھتی پہاڑ سی مہنگائی......

وہی شکل کا اچھا تھا۔ لماں زار زار روئیں۔ لیکن دولت مند تیز طرار نند کے آگے چوں نہ کر پائیں۔

”یہاں رہ کر اس کا کون سا مستقبل بننا ہے؟ ہم اسے پڑھا لکھا کر انسان بنا دیں

گے۔" پھوپھا نے تکبّر سے کہا تھا۔ پھوپھا، پھوپھی نے اسے واقعی انسان بنادیا تھا۔ بدن سے ڈھیلا سفید لٹھے کا کرتا، پاجامہ اتار کر ہاف پینٹ چڑھادی۔ کانونٹ اسکول میں پڑھایا۔ اچھا کھلایا پلایا......

اماں کی موت کی اطلاع بھی اسے نہیں دی۔ بعد میں پھوپھی نے بتایا۔ "تمھارے امتحان چل رہے تھے اس لیے نہیں بتایا۔"

وہ دل ہی دل میں خوب گُھٹا۔ لحاف میں منہ چھپا کر بے آواز مہینوں رویا۔

بالغ ہونے پر پھوپھا نے اس کے نام سے نئی فیکٹری ڈال دی۔

انسان محنت اور کوشش سے چمکتا ہے۔ اس نے دل و دماغ سب فیکٹری میں لگا دیا۔ چند برسوں میں اس کا شمار کراچی کے گنے چنے کروڑ پتیوں میں ہونے لگا تھا۔

دولت، دولت کو کھینچتی ہے۔ پھوپھا لکھ پتی تھے وہ کروڑ پتی بن گیا۔

حسین و جمیل لڑکیاں پاس منڈلاتیں۔ "کوپ منڈوپ سے باہر کب نکلو گے بھئی" لوگ مذاق اُڑاتے۔ ریشم کے کیڑے کا خول اس پر اتنا سخت چڑھا تھا کہ اُترتا ہی نہیں تھا۔

اماں کے سوا وہ کبھی کسی سے جڑا ہی نہیں۔

پھوپھی عمر بھر ساتھ رہیں۔ لیکن وہ دل سے ان کا کبھی نہیں ہو سکا۔ وہ اپنی جاہل، برقعہ پوش، نو بچوں والی اماں کے ساتھ ہی چپکا رہا۔

پھوپھی کے بال جدید طرز میں کٹے رہتے۔ وہ خوشبوؤں سے مہکتی رہتیں۔ بھڑکیلے لباس زیب تن کرتیں۔ میک اپ سے چمکتیں۔ اس کو کپڑوں کی کریز بچا کر سینے سے لگاتیں۔

"میرا لعل...... میرا بیٹا......" سب کے سامنے کہتیں۔

اکیلے میں ہڑکاتیں۔ مخصوص کلمات سے نوازتیں۔

"دیہاتی...... ملیچھ......"

وہ ڈرا سہما رہتا۔ پارٹیاں ہوتیں تو گھر کے کونے کھتروں میں دُبک جاتا۔ لاکھ بلانے پر نکلتا۔ بات کرتا تو آواز حلق میں پھنس جاتی۔ کبھی زور سے ہنسا بھی نہیں۔

"ناجانے کون سی گتھی ہے اس لڑکے کے دل میں جو کھلتی نہیں۔" پھوپھی بڑبڑاتیں۔

"گھنا ہے لڑکا......" پھوپھا منہ بچکا کر کہتے۔

شادی اس کی پھوپھی نے بڑے ارمان سے کی۔ اپنی ساری تمنائیں نکال لیں۔ ہاؤسنگ سوسائٹی میں مہینوں چرچا رہا۔ شاندار دعوتیں ہوئیں۔ بڑے بڑے منسٹر آئے۔ لاکھوں منٹوں میں لنڈھایا گیا۔ بیوٹی پالر میں پھوپھی نے اس کی رگڑائی کرائی۔ مینی کیور، پیڈی کیور، مساج، فیشل، سونا باتھ اور نہ جانے کیا کیا۔ لیکن اس کا کھردرا پن نہیں گیا۔

سہرے کے اندر اس کی آنکھ بار بار بھر آتیں۔ کاش آج اماں ہوتیں۔ کاش اماں ہوتیں......اماں ہوتیں....

حالانکہ بے چاری اماں ہوتیں تو کیا کرتیں؟ ہلدی لگاتیں اُسے۔ منہ زور، پرکٹی، کھلی پشت کا نیچے گلے کا برائے نام بلاوز پہنے بہو کو دیکھتیں تو غش کھا جاتیں۔ ان کے تو سر سے چادر نما دوپٹہ بھی کبھی سرکا نہیں تھا۔

حسن وزٹ ویزہ پر ہندوستان پہنچ گیا۔

دلی، لکھنؤ، سلطان پور، پھول پور.....

کھٹ، کھٹ، کھٹ سڑک پکی ہوگئی ہے۔ ٹیکسی دروازے پہ رُکی، کئی آنکھیں ڈیوڑھی سے آن لگیں۔ سب سے اس کا تعارف کرایا گیا۔ بھانجیاں، بھانجے، بھتیجے، چھوٹی نئی بہوئیں.....

یک لخت اُسے اجنبیت کا احساس شدت سے ہوا۔ آداب بڑے ابّا۔ سلام بچچا۔ ماموں جان تسلیم......

اُسے بڑے بھیا جیسے القاب سے نوازا جانے لگا۔ اُسے رونا آنے لگا۔ اس کو اس کے نام سے پکارنے والا کیا کوئی نہیں بچا؟

حسن...... حسنو...... حسنا...... حسنوا...... کہنے والا...؟

منہ دھونے وہ غسل خانے میں گھسا۔ سیلا غسل خانہ اب نیم تاریک نہیں رہا تھا۔

چنا ہوا روشندان کھول دیا گیا تھا۔ دو گوریاں وہاں بیٹھی طوطا مینا کی کہانی سنا رہی تھیں۔ "ایک تھا بادشاہ، ہمارا تمھارا خدا بادشاہ،...."

اماں ہر کہانی شروع کرنے سے پہلے یہ ضرور کہتی تھیں۔

الگنی پہ میلے کپڑے نہیں ٹنگے تھے۔ دیگ غائب تھی۔ نل کی ٹونٹی منہ چڑا رہی تھی۔ ریٹھے آؤنلے غائب...... شمپو کی لمبی بوتل سامنے کھڑی تھی۔ فنیل کی تیز مہک دماغ میں گھسی جا رہی تھی۔ سنگِ مرمر کی چوکی جگہ جگہ سے درک گئی تھی۔

اماں.... اماں... اماں.... اس کا جی چاہا خوب زور زور سے چلائے۔

غسل خانے سے نکلا۔ صحنچی میں میز پر بون چائینا کی نئی پلیٹوں میں ناشتہ سجا تھا۔

"کوئی تام چینی کی رکابی بچی ہو تو...."

پاس کھڑی بھتیجی زور سے ہنس دی۔

بہت ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک سفید دھاری والی ہری رکابی اس کے سامنے رکھ دی گئی۔ اس میں ایک سیاہ سوراخ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ روٹی نہیں رکابی کھا رہا تھا۔ کانٹے، چھری، چمچے، میز پر رکھے رہے۔ وہ ہاتھ سے کھاتا رہا۔ شہلا دیکھ لے اُسے اس طرح کھاتے تو..... "اُف جانور سے بدتر...." کہے گی.... وہ ہنسا۔ سب نے تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

بڑے اشتیاق سے اس نے بیتے ہوئے دنوں کی باتیں کیں۔ لیکن باتیں جلدی ہی ختم ہو گئیں۔ اسے کچھ مایوسی ہوئی۔ کوئی موضوع نہیں مل رہا تھا بات کرنے کو۔

رات سب کی چارپائیاں وسیع صحن میں بچھ گئیں۔ اس کا پلنگ ایک دم کونے میں ڈالا گیا۔ اسے بار بار یہ احساس ہونے لگا کہ وہ بیکار آیا.... جو خلوص و محبت لینے وہ آیا تھا وہ کہیں نہیں تھی۔ شاید یہ بدلاؤ فطری تھا۔ شاید وہ خود بھی بدل گیا تھا۔ فاصلہ اور وقت انسان کو کس طرح بدل دیتا ہے۔ دودھیا چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ اسے ہلکی سی غنودگی آگئی۔

دور کی چارپائی سے ایک آواز ٹن سے اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"کون چکر میں آئے ہیں کچھ بتائن؟"

"جائدات ماحصہ بات کرے آئے ہوں گے اور کاہے اتنی دُور سے چلے آرہے ہیں۔"

"اتنی دولت ہے تب بھی؟"

"اری.... ہوس کا پیٹ کبھو بھرتا ہے؟"

"ایک دم خبط الحواس لگت ہیں۔"

"روپیہ جیادہ ہے ناوہی کی گرمی دماغ میں چڑھی ہے۔"

"لنگڑی خالہ کو پانچ سو کا ہراپتہ دے ڈالے"

"سالے..... آجاتے ہیں ہمیں ذلیل کرنے..."

وہ رات بھر کھلے آسمان میں تارے تکتا رہا۔

آسمان اور زمین کے درمیان وسیع خلاء لامتناہی اور ہیبتناک خلاء جس میں وہ چھوٹا سا لڑکا بھٹک رہا ہے۔ کھو گیا ہے۔

صبح کا تارا رخصت ہونے لگا تو وہ اُٹھ گیا۔

باغ کا چکر لگا آیا۔ سارے پرانے پیڑ سوکھ چکے تھے۔

ناشتے کی سجی میز پہ اس نے کہا۔ "کلو سے کہنا ٹیکسی لے آوے کل سویرے۔"

"کیوں؟ ویزا تو مہینے بھر کا لگا ہے آپ کا؟"

"شہلا گھبرا رہی ہو گی۔"

حالانکہ اُسے معلوم تھا شہلا اس کی غیر حاضری میں خوب انجوائے کر رہی ہو گی۔

"اماں میں کہاں سکون پاؤں؟" اماں کی خستہ حال قبر پہ فاتحہ پڑھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

قبرستان کی بے ترتیب گھاس ہنسنے لگی۔ اماں، ابا، بابا، چچا، دادی کی قبروں پہ دھول کے بگولے ناچنے لگے۔

□

سوریہ ونشی چندر ونشی

یہ سارا جھگڑا اس وقت سے شروع ہو گیا جب روحی خان ولد مرحوم محمد عباس خان بھالے سلطان نے بڑے چچا کی الماری صاف کرتے کرتے مقدمے کی بھاری فائل گِرا دی۔ پھر اٹھا کر رکھنے لگیں تو ٹکڑے ٹکڑے شکستہ کپڑے پر چھپے خاندانی شجرے پر نظر پڑ گئی۔ تجسّس بڑھا! جانکاری بڑھی! اصل میں یہ جانکاری ہی انسان کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ نہ انسان جانے نہ سوچے نہ سمجھے بس جیے جائے تو جینا کتنا آسان، کتنا سہل ہے۔ جو بزرگوں نے کہہ دیا اس کو آنکھ بند کر کے قبول کرتا جائے۔ ذرا سا لیک سے ہٹا نہیں کہ ہنگامہ شروع۔

روحی کی نظریں خاندانی شجرے پر جم گئیں۔ فوراً قلم کاغذ لے کر بیٹھ گئی اور کپڑے کے ٹکڑوں کو جوڑ کر شکستہ دستاویز کو سفید کاغذ پر اُتارنے لگی۔ بڑے چچا نے ٹوکا۔ امّی نے سمجھایا۔ اقبال بھیاّ نے منع کیا۔ بڑے ابا نے آنکھیں دِکھائیں۔ لیکن روحی تو صدا کی ضدی۔ جس بات کی دُھن سوار ہو جائے۔ شجرہ اس نے رات کے اندھیرے میں لالٹین کی مدھم روشنی میں پھر ایک بار پڑھا......

سوریہ ونشی چھتریوں کے قومی اور گوتری شجرے اور ان کا مورث اعلیٰ بیومت منو (جناب نوح) اور اُن کے لڑکے اکشواس جس نے اجودھیا کو آباد کیا۔ اس سے لے کر راجہ رام چندر جی تک کل ۷۵ پشتیں ہوتی ہیں۔ (بقول کرنل ٹاڈ)

راجہ رام چندر جی سے شالباہن تک ۳۰ پشتیں ہوتی ہیں۔ شالباہن سے رائے برار تک ۴۳ پشتیں ہوتی ہیں۔

راجہ رام چندر

↓

لَو ———————— کُش

↓ بسین ↓ برگوجر ↓ گوہل ↓ راٹھور ↓ گھاوت ↓ کاٹھی

↓ بھالے سلطان ↓ کجلوئی ↓ راجکمار

رائے برار

↓ راج سنگھ ↓ کنور سنگھ ↓ برہم دیو سنگھ

↓ پالی دیو ↓ راگھورائے ↓ ناہر سنگھ

پالی دیو
معروف بہ
ملک پال خان

↓

ہم خان

↓

تتار خان

↓

جمشید خان (شیعہ ہوئے)

↓ اعظم خان ↓ ↓ اصغر خان (لاولد)

اعظم خان

↓

حسن خان

"او...... گاڈ...... میں سوریہ ونشی ہوں!" اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔

"ہوں"...... اماں جانی نے ہنکاری بھری۔

"اماں میں سوریہ ونشی ہوں۔"

اماں نے جھلا کر ہاتھ پنکھا پھینک کر مارا۔ "بدتمیز لڑکی...... اللہ سے ڈر......"

"ارے میں رام چندر کی اولاد ہوں......"

"خدا غارت کرے تمھیں۔" اماں صلواتیں سنانے لگیں۔ وہ منہ تک چادر اوڑھ کر ہنستے ہنستے سو گئی۔

صبح اٹھتے ہی اس نے اقبال بھیا کو پکڑ لیا۔ "یہ لڑکیوں کا نام شجرے میں کیوں نہیں ہوتا؟"

اقبال بھیا نے گھور کر دیکھا "حد میں رہو لڑکی۔"

میرا نام ضرور لکھوا دیجیے نہیں تو میں خود ہی لکھ دوں گی۔"

"بکو مت" اقبال بھیا کھسک لیے۔

"ہم پانچ پشت سے ہی تو شیعہ ہوئے ہیں پچا۔"

"ہوں" پچا گنگنائے "پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں۔"

"یہ بحث کرنے کے بجائے روحی بیگم باورچی خانے میں جا کر چچی کے ساتھ شامی کباب بنواؤ۔" اماں جانی نے سروتا پٹک کر ٹوکا۔

وہ جھٹ اپنی کورس کی کتابیں سمیٹ کر کوٹھے پر چڑھ گئی جہاں وہ اطمینان سے پڑھ سکتی تھی۔ وہ خاندان کی پہلی لڑکی تھی جس کو کالج میں تعلیم دلائی جا رہی تھی۔ نیچے اماں جانی چلاتی رہیں۔ وہ اوپر چڑھ کر نوٹس بناتی رہی۔ بی۔ اے میں اس نے پورے قصبے میں امتیازی نمبر پائے اور شہر میں جا کر قانون پڑھنے کی ضد باندھ لی۔

پورا خاندان قانون پڑھنے کے خلاف۔ "یہ بھلا لڑکیوں کے پڑھنے کی کوئی چیز ہے؟" بڑے پچا چیخے۔

"بڑے پچا یہ چیز نہیں ہے کوئی، علم ہے اور علم حاصل کرنا میرا حق ہے۔" اس نے

بے خوف ہو کر کہا۔

"حق......؟ یہ ابھی سے حق کی بات کرنے لگیں۔ جانتی بھی ہو لڑکیوں کا کوئی حق نہیں ہوتا۔" اقبال بھیا بگڑے۔

"یہ میں کیسے مان لوں کہ لڑکیوں کا کوئی حق نہیں ہوتا؟ یہی جاننے کے لیے تو میں قانون پڑھوں گی۔"

اور ضدی روحی نے ابّی کو راضی کرلیا۔ کیونکہ ان کو منانا سب سے زیادہ آسان تھا اور وہ تعلیم نسواں کے خلاف بھی نہیں تھے۔ لیکن ہاسٹل میں رہنے کی اجازت نہیں ملی۔ روحی نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ اماں جانی کا اختلاج بڑھ گیا اور بڑے ابا کا بلڈ پریشر۔ جھک مار کر اجازت دے دی گئی۔ بی روحی اپنی جیت پر خوش خوش ہاسٹل آ گئیں۔ سخت ہدایتیں دی گئیں کہ کسی قسم کی خرافات نہ کرنا، صرف پڑھائی سے مطلب رکھنا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ساری ہدایتیں طاق پر رکھ کر روحی شہر کی رونق میں کھو گئیں اور چند ہی مہینوں میں آل انڈیا اسٹوڈنٹ فیڈریشن کی لیڈر بن گئیں۔ اخبارات میں اس نے نظام سرمایہ داری کی مخالفت میں مضامین لکھنا شروع کیے۔ شہر میں ان مضامین نے تہلکا مچا دیا۔ ایک جاگیر دار گھرانے کی لڑکی اتنی روشن خیال...... شہر کی ساری خبریں اقبال بھیا قصبے میں پہنچانے کا کام نہایت تندہی سے کرتے رہے۔ خود بے چارے دس سال شہر میں رہ کر بھی بی۔اے پاس نہ کر پائے۔ مڈل تو قصباتی ماسٹروں نے نقل کرا کے پاس کرا دیا تھا۔ زمیندار گھرانے سے کس کو دشمنی مول لینی تھی۔

دھیرے، دھیرے اس نے سارے خاندان کی ہمدردیاں کھو دیں۔ اس سے ملنے لمبی چھٹیوں میں بھی کوئی نہیں آتا تھا۔ اس نے بھی گھر کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن برسات کی رات میں جب کوئی جگنو اس کے کمرے میں آ جاتا تو اس کو اپنا بچپن اور گھر بُری طرح یاد آنے لگتے۔ اس کا تکیہ روتے روتے بھیگ جاتا۔ اس کی روم پارٹنر سریتا سریواستو ہی اس کے آنسوؤں کی نمی کو محسوس کرتی اور تسلی دیتی۔ "ابھی ہمیں بہت لمبی لڑائی لڑنی ہے بی کم بولڈ ڈیر (Becom bold dear)"

اس کی اداسی سے عاجز آکر ایک دن سریتا کہہ ہی بیٹھی۔ ''چلی کیوں نہیں جاتی ہو گھر کچھ دنوں کے لیے؟ تمھارا جی بھی بہل جائے گا......''

''پچھلی بار جب میں گھر گئی تھی تو میرے بڑے بھائی نے اپنے بچّے کے ساتھ کرکٹ کھیل رہے گاؤں کے ایک بچے کو صرف اس لیے بیٹ سے مار مار کر نیلا کر دیا تھا کہ اس نے ان کے بچّے سے زیادہ رن بنا لیے تھے۔ اور ان کا بچہ رو دیا تھا۔ مار کھا کر لڑکے کے منہ سے خون نکل آیا تھا اور مجھ سے کئی دن کھانا نہیں کھایا گیا۔ بھائی جان نے مجھے سمجھایا تھا کہ 'بنّو تم ان باریکیوں کو نہیں سمجھ پاؤ گی۔ تم شہر میں رہتی ہو۔ یہ ہماری رعایا ہے اور اگر ان سور کے بچوّں کو سبق نہ دوں تو کل کو یہ ہمارے خاندان کے وقار کو بھلا دیں گے'— پھر میں نے ان کو گھر کی ایک کمسن ملازمہ سے چوری چھپے ملتے دیکھا تو مجھے اتنی نفرت محسوس ہوئی کہ میں نے بلڈ ریلیشن پر یقین کرنا ہی چھوڑ دیا۔ جہاں انسانیت کے کوئی معنی نہ ہوں وہاں رشتے کیا اہمیت رکھتے ہیں؟'' اس نے سریتا سے پوچھا۔

سریتا نے اس کے گھنے کالے بالوں کی چٹیا باندھ کر اس کو بستر پر ڈھکیل دیا ''اب جلدی سو جاؤ، فضول باتیں نہ سوچو بٹیا رانی۔ صبح مجھے زیرو پیریڈ اٹینڈ کرنا ہے۔''

یہ ان کا قانون کا آخری سال تھا۔ اور ان کو اچھے نمبر لانا تھے۔ پھر اسکالر شپ کا مقابلہ بھی نکالنا تھا۔ کیونکہ بڑے ابا نے اقبال بھیا کی باتوں کا اعتبار کر کے اس کو منی آرڈر بھیجنا بند کر دیا تھا تاکہ وہ اپنی پڑھائی بھی بند کر دے۔ آج کل سریتا اس کا خرچ بھی اُٹھا رہی تھی۔ دونوں ایک ہی منی آرڈر کے انتظار میں رہتی تھیں۔ سریتا سریواستو کے گھر کے حالات بھی اچھے نہیں تھے۔ نہ ہی وہ زیادہ روپیہ منگا سکتی تھی۔ اس کے والد بیمار رہتے تھے اور ماں ایک پرائمری اسکول میں دُور دراز گاؤں میں پڑھاتی تھیں۔ وہی اس کا خرچ بھی بھیجتی تھیں۔ دونوں ناشتے میں بغیر دودھ کی کالی چائے پیتیں اور اُبلے چنے کھا کر پیٹ بھرتیں۔ کتابیں خریدنے کی قوت نہیں تھی اس لیے ایک طالب علم دوست کی دکان سے کتابیں لا کر رات بھر جاگ کر نوٹس بناتیں اور علی الصبح واپس کر آتی تھیں۔

اسکالرشپ کا رزلٹ آگیا۔ دونوں کو ناکامی حاصل ہوئی۔ قانون کا آخری سال بڑی مشکل سے گزرا۔ اس بیچ اسے ریڈیو پر پارٹ ٹائم کام ملا تو کچھ راحت محسوس ہوئی۔ دونوں نے سکنڈ کلاس میں قانون کی ڈگری حاصل کرلی۔ سریتا گھر چلی گئی اور روحی نے مشہور وکیل وجے سنگھ کے انڈر میں ہائی کورٹ جوائن کرلیا۔ وجے سنگھ اسے کچھ نہ کچھ مالی امداد بھی دیتے رہتے۔

دسمبر کی ایک دُھند بھری سمٹی شرمائی سی صبح میں روحی نے کورٹ جانے کے لیے کالا کوٹ زیب تن کیا اور ہاسٹل کے گیٹ کی طرف بڑھی ہی تھی کہ اقبال بھیا آتے دکھائی دیے۔ 'خیریت؟' اتنے دنوں بعد ان کو دیکھ کر اس کا دل انجانے خطرے سے دھک دھک کرنے لگا۔

"فوراً گھر چلو، اماں جانی سخت بیمار ہیں۔" وہ روتی ہوئی گھر کے لیے چل پڑی۔ یکّے سے اترتے ہی اس کے کانوں میں شادیانوں کے بول پڑے جنھیں میراثنیں روایتی انداز میں دوہرا رہی تھیں۔ گھر کی رونق باہر ہی سے اعلان کررہی تھی کہ کسی کی شادی کا ہنگامہ ہے۔

"کس کی شادی کا انتظام ہو رہا ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ کی" اقبال بھیا بڑی کمینگی سے مسکرائے۔

"مجھ سے پوچھے بغیر؟ آپ نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟...... کہ اماں جانی......؟" غصہ اور رنج سے اس کا حلق خشک ہو گیا، آواز پھٹ سی گئی۔

"اگر میں سچ بولتا تو کیا وکیلنی صاحبہ تشریف لاتیں؟" انھوں نے کلیجے میں برچھی کی انی لگادی۔ اس نے غصے میں پیر پٹخ ڈالے۔ سب نے اس کو نرغے میں لے لیا۔ روتے روتے اس کو اپنی بے بسی پر ہنسی آنے لگی۔ دل کڑا کر کے اس نے مورچہ سنبھال لیا۔

"اے بی بی گھر کا دیکھا بھالا لڑکا ہے۔ چچا کی اولاد...... انجینئر۔"

"اماں جانی وہ انجینئر نہیں جونیئر انجینئر ہے۔ ڈپلومہ پاس" اس نے نتھنے پھلائے۔

"اے...... تمھاری طرح کالج کی پڑھی لکھی نہیں۔ لیکن یہ سمجھ لو کہ تم کو خاندان کے بزرگوں کی بات ماننی ہے۔"

"جی نہیں، شادی مجھے کرنی ہے، فیصلہ میں خود کروں گی۔"

"ہم لوگ یوں ماں باپ سے زبان نہیں لڑاتے تھے۔ جو کہتے تھے مان لیتے تھے۔" چچی پھسپھسائیں۔

"تبھی تو چچا سے آپ کی کبھی نہیں بنی۔ وہ صالحہ پھوپھی کو آج بھی چاہتے ہیں اور آپ ان کو قابو میں کرنے کے لیے رات دن وظیفے پڑھتی ہیں۔"

"خدا کے لیے زبان کو لگام دو رُوحی...... یہ آوازیں باہر جائیں گی تو مردانے میں سب کیا سمجھیں گے۔ شہر میں کسی مردوئے کو چاہنے تو نہیں لگیں تم؟" بڑی اماں نے کہنی ماری۔

"کہنی مار مار کر مجھے خاموش نہیں کرا سکتیں آپ بڑی اماں۔ میں شہر میں کسی کم بخت کا منہ بھی نہیں دیکھتی۔ لیکن ابھی چیخ چیخ کر کہہ دوں گی کہ مجھے عادل جیسے دبو رئیس سے شادی نہیں کرنی...... نہیں کرنی......"

"کیوں...... کیوں نہیں کرنی...... تم میں سُرخاب کے پر لگے ہیں؟" اماں جانی کھول اٹھیں۔

"ہاں مجھ میں سرخاب کے پر لگے ہیں۔ میں ہرگز شادی نہیں کروں گی۔ زہر کھالوں گی۔ میں آپ کی زمین کا قطعہ نہیں ہوں کہ جس کو چاہے آپ دے دیجیے۔ اکیس سال کی لڑکی ہوں۔ قانونی حق ہے میرے پاس بالغ ہونے کا......"

اماں جانی کو اختلاج کا دورہ پڑ گیا۔

اس نے فیصلہ ابّی کے سامنے پیش کر دیا۔ "آپ لوگ اپنی مرضی کر لیجیے۔ میں آپ لوگوں کے خلاف مقدمہ لڑوں گی۔ یہ نکاح ناجائز ہو گا۔"

"لیکن کیوں بٹی؟" ابّی نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کی نفرت کا آتش فشاں پھٹ پڑا۔

"ابّی یہ بدعقل میری زندگی عذاب کر دے گا۔ بڑی چچی کے تانے مجھے گھٹ

گھٹ کر مرنے پر مجبور کر دیں گے۔ سعودی عرب کا سنہرا پنجرہ مجھے راس نہیں آسکتا۔ مجھے آزادی چاہیے۔ میرا پورا کیریئر چوپٹ ہو جائے گا......"

ابی ایک دم گم صُم ہو گئے۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور باہر نکل کر بڑے چچا کے یہاں انکار کہلا دیا۔ گھر بھر میں محشر بپا ہو گیا۔ خوب رونا پیٹنا مچا۔ بڑے ابا اپنے مکمل چنگیزی جلال کے ساتھ دہاڑتے ہوئے نکلے۔ خوب صلواتیں پڑیں اس پر۔ وہ سر جھکائے سب کی آوازیں سنتی رہی۔ غنودگی سی طاری ہو گئی اس پر۔ لگا ڈھیر ساری مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔ صبح پہلی بس سے وہ ہاسٹل واپس آگئی۔ ہاسٹل آتے ہی اس کو سریتا سریواستو کا خط ملا کہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا ہے اور وہ ماں کے اسکول میں ہی پرائمری کلاسیس کو پڑھانے لگی ہے کیونکہ اب اس پر چھوٹے بھائی بہنوں کی ذمہ داری بھی آگئی ہے۔

"سنا تھا اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔" روحی نے چپکے سے سوچا اور دل مضبوط کر کے وجے سنگھ کے مقدموں کی فائل پڑھنے لگی۔ ہندو لا اور مسلم لا کا موازنہ کرتے ہوئے اس نے لکھا۔ نکاح ایک معاہدہ ہے جو کہ دو پارٹیوں کے بیچ کیا جاتا ہے (Nikah is a Contract) اور اس کو توڑا بھی جا سکتا ہے، طلاق کی صورت میں۔ جب کہ ہندو لا میں شادی ایک مکمل مذہبی رسم ہے جس کو توڑا نہیں جا سکتا۔ مذہبی طور پر، ہاں عدالت سے طلاق حاصل کیا جا سکتا ہے۔

شاید وجے سنگھ نے اس کو کسی کولیگ سے کہتے سن لیا تھا کہ وہ سوریہ ونشی ہے اور کنورٹیڈ مسلم ہے۔ "میں چندرونشی ہوں" انھوں نے ایک دن اس کو بتایا تھا۔ اس کو یہ خبر پا کر ہنسی جیسا کوئی ردِ عمل نہیں ہوا کیونکہ عرصہ ہوا اس نے ہنسنا چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ وہ ٹھیک سے ہنس بھی نہ سکی۔ ایک نیوٹرل زون میں وہ کافی عرصے سے جی رہی تھی۔ ابی اور اماں جانی کے انتقال کی خبر ملے اس کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔

ایک اُداس سی برسات کی شام تھی۔ نیم کے کسیلے پھولوں کی نرم مہک۔ بھیگی بھادوں کی ہوا۔ بارش کے قطرے درختوں پر ٹھہر سے گئے تھے۔ اچانک چیمبر میں بجلی چلی گئی۔ کمرے میں تنہا وجے سنگھ اور روحی خان ہی تھے۔ وجے سنگھ نے ماچس کی

تیلی جلائی۔ چیمبر میں سناٹا سائیں سائیں کرنے لگا۔ اس کا دل زور سے دھڑکا۔ ماچس کی تیلی بجھ گئی۔

کرانک بیچلر۔ وجے سنگھ نے سرگوشی میں اس کو پروپوز کردیا۔ گھبراہٹ میں اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہوگئے۔ یہ حادثہ بھی میری زندگی میں ہونا تھا؟ اس نے بے کسی سے سوچا۔ اگلے دن اس نے سریتا کو ایک طویل خط میں یہ حادثہ بھی لکھا۔ فوراً ہی جواب آگیا۔ سریتا نے لکھا تم ۳۵ کے اوپر ہو چکی ہو۔ فیصلہ کرلو تو بہتر ہے۔ کب تک اکیلی زندگی سے جوجھتی رہو گی۔ پھر ایک دن ہائی کورٹ میں ہی چند دوستوں کی موجودگی میں روحی خان مسز سنگھ بن گئیں۔ لیکن وہ اپنی ضد کے لیے ہمیشہ روحی خان ہی لکھا تیں۔ حالانکہ اس کو شکست کا احساس ہونے لگا تھا۔ سریتا سریو استو کہتی بھی تھی۔

کب تک بھٹکتی رہو گی؟

جب تک سنبھلوں گی نہیں!

کب سنبھلو گی؟

جب بھٹکنا چھوڑ دوں گی!

اور شاید وہ بے منزل تلاش میں بھٹک گئی تھی، سوتی تھی تو عجیب عجیب خواب آتے۔ بار بار آنکھ کھل جاتی۔ پسینے سے نہا جاتی تھی۔ پاس لیٹے وجے کو اٹھانا چاہ کر بھی نہ اٹھا پاتی۔ جگا بھی دیتی تو وہ اس کو بیز وفرونک کہہ کر جھڑک دیتا۔

نیند کے خمار میں لگتا دَلدل میں پھنستی جارہی ہے۔ وہ اپنے ریزہ ریزہ ہوتے ہوئے وجود کو سمیٹنا چاہتی تو وہ اور بکھر جاتا۔ آوازیں، کردار۔ سب ہیولے بن جاتے۔ دھند میں چہرے گم ہو جاتے۔

''السلام علیکم'' ...... بڑے چچا آرہے ہیں۔

دماغ میں مندر کا گھنٹہ ٹن سے بولتا۔ بوڑھے پنڈت کے بول گونج جاتے:

سنکٹ ہرے مٹے سب پیرا

جو سُمرے ہنو مت بل بیرا

ابّی کے چہرے کی جھریاں مسکراتیں۔ سبھی کردار ماضی میں تحلیل ہو جاتے۔ اذان

کی آواز میں شنکھ کی آواز شامل ہو جاتی۔

روحانی طمانیت کی گھڑی...... لیکن وہ اور مضطرب ہو جاتی۔ اشلوک صاف طور پر سنائی دیتے۔

کیا بے کراں خلا میں بھٹکنا ہی زندگی ہے؟ وہ چونک کر اٹھ بیٹھتی۔ وجے کے خراٹے گونجتے رہتے۔ اس کی نظر اپنی شادی کی تصویر کے فریم پر جم جاتی جس پر گرد بیٹھ رہی تھی اور تصویر کا کاغذ بوسیدہ ہو کر زردی مائل ہوتا جارہا تھا۔

□□
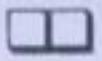
خوشبو

شاید تم کو یقین نہ آئے کہ مجھے دھوئیں میں خوشبو محسوس ہوتی ہے، ایک عجیب سی خوشبو۔ دھوئیں سے کبھی کبھی ایک تلخ سی کسیلی خوشبو آتی ہے اور کبھی کبھی بے حد نرم سی خوشبو...... روٹیوں کی مہک لیے ہوئے۔

ہمارے گھر میں کھانا لکڑی والے چولہے پر پکتا تھا۔ لکڑیاں جلا کر میری بڑی بہن چپاتیاں پکاتی تھی اور میں اُکڑوں چولہے کے آگے بیٹھ کر دھوئیں کی خوشبو اور انگاروں سے باتیں کرتا تھا۔ اکثر بے خودی کے عالم میں ہاتھوں کو آگے پھیلا لیا کرتا تھا۔ میری بہن کی روٹی پھٹ جاتی تھی اور وہ جھنجھلا کر مجھے ڈانٹتی تھی۔ "پیچھے ہٹ۔ بیوقوف۔ میری چپاتی خراب کر دی۔"

اب میری بہن لندن میں ہے۔ وہاں بند ڈبوں کا کھانا خود کھاتی ہو گی، اپنے شوہر و بچوں کو کھلاتی ہو گی۔ میں ہوٹل پر...... ڈبل روٹی پر جی رہا ہوں۔ لیکن جہاں کہیں بھی دھوئیں کی لکیر شام کو یا صبح کے دھندلکے میں اُٹھتی دیکھتا ہوں یہی محسوس کرتا ہوں کہ یہ خوشبودار دُھواں روٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو لیے ہوئے ہے۔

مجھے پتیوں سے ہری ہری خوشبو آتی ہے، دھان کے کھیت سے دھانی دھانی خوشبو۔ مجھے خود حیرت ہے کہ مجھے خوشبو کا رنگ کیسے محسوس ہو جاتا ہے؟ ہلکی ہلکی شروع کی سردیوں میں مجھے گلابی گلابی خوشبو آتی ہے اور یہ موسم مجھے بے حد پسند ہے۔ جب میں اپنی بہن کے ہاتھوں کا بنا ہوا اپل اوور پہن کر کشادہ سڑکوں پر یوکلپٹس کے سایہ دار درختوں کے نیچ سے گزرتا ہوں اور جاڑوں کی گلابی گلابی خوشبو محسوس

کرتا ہوں۔

میں صرف اپنی بہن کے ہاتھوں کے بنے ہوئے سوئیٹر پہنتا ہوں۔ نہ بازار کے نہ ہی کسی اور کے ہاتھ کے۔ کیونکہ اس کے ایک ایک پھندے میں میرے لیے ممتا کی خوشبو رچی بسی ہوتی ہے۔

میری اماں مجھے جنم دیتے ہی گزر گئی۔ مجھے میری بہن نے اپنے بچے کی طرح پالا پوسا۔ حالانکہ وہ مجھ سے صرف آٹھ سال ہی بڑی ہے، لیکن مجھ سے بزرگوں جیسا برتاؤ رکھتی ہے۔ وہ مجھے آج بھی بچہ سمجھتی ہے جبکہ میں اٹھائیس سال کا اچھا خاصہ میچور لڑکا ہوں۔ ایک فرم میں اکاؤنٹ سیکشن میں کام بھی کر رہا ہوں۔

جب اس کی شادی ہوئی تو میں چھوٹا ہی تھا اور اس کی شادی سے میں بہت خوش تھا کہ وہ چلی جائے گی تو گھر میں مجھے ڈانٹنے والا کوئی نہیں رہے گا۔ پاپا مجھے کبھی نہیں ڈانٹتے تھے اور میں اپنی من مرضی کروں گا۔ دوپہر میں باغ میں جاکر آم توڑوں گا۔ دن بھر گھوموں گا۔ تالاب میں پتھر پھینکوں گا۔ نوکروں کے بچوں پر ہاتھ آزماؤں گا۔ کتابیں سب چھپادوں گا اور ماسٹر جی کو بھگادوں گا۔ آ...... ہا...... ہا...... او...... ہو...... کتنا مزہ آئے گا۔ میں کتنا آزاد ہوں گا۔ وقت پر کھانا کھاؤ۔ وقت پر سوؤ۔ اٹھو۔ پڑھو۔ وہ ہر وقت میرے پیچھے حکم کا حقہ لیے چلتی تھی۔

اس کی رخصتی پر سب رو رہے تھے، وہ بھی مجھے گلے لگا کر خوب روئی لیکن میری آنکھیں نم نہ ہوئیں۔ میں سوچ رہا تھا کب اس کی سجی ہوئی کار نظروں سے دُور ہو اور کب میں آزادی کا نعرہ لگاتا ہوا میدان میں بھاگ جاؤں اور من مانی کروں۔

اس کا موٹا دولہا مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ جبکہ سب لوگ میرے پیچھے پڑے تھے اس کے پاس جاکر بیٹھو۔ وہ مجھے گھور رہا تھا میں اسے گھور رہا تھا۔

میری بہن تو اتنی نازک سی گوری سی، ایک دم جوہی کا پھول تھی اور یہ موٹا۔ مجھے اس پر بڑا غصہ بھی آرہا تھا کہ یہ میری بہن کو کیوں لے جارہا ہے؟ لیکن لے جانے دو جی۔ مجھے کیا؟ ہر وقت کی غلامی سے تو میری جان بچی رہے گی۔ آرام سے خوب دیر تک سوکر صبح اُٹھوں گا، نہاؤں گا بھی نہیں۔ سارا کام اپنی مرضی سے کروں گا۔

"ہوں...... بڑی آئیں وہاں کی۔"

اس کی کار دُھواں اگلتی ہوئی، پھولوں سے مہکتی گاؤں کی کچّی سڑک پر ڈگمگاتی چلی جارہی تھی۔ میں باغ کی فصیل پر کھڑا دیکھ رہا تھا۔ کار کے اوجھل ہوتے ہی میں نے آزادی کا نعرہ بلند کرنا چاہا، لیکن نعرے کی آواز میرے حلق میں ہی پھنس گئی۔ نہ جانے کیسے میرا دل درد کی شدّت سے کراہ اُٹھا اب میرا کون خیال رکھے گا؟ مجھے کون پیار کرے گا؟ کون صبح صبح لاڈ سے اُٹھائے گا؟ سالگرہ کے دن کون میری پیشانی چومے گا؟ اپنے ہاتھوں سے کون نوالے بنابنا کر کھلائے گا؟ یکایک میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ آنسوؤں کا سیلاب سا آگیا۔ میری قمیض کی دونوں آستینیں بھیگ گئیں۔ میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ میں گھر بھی واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہاں میرا کوئی بھی انتظار نہیں کر رہا ہوگا۔ خالی دروازہ میرا استقبال کرے گا۔ کسی کی دو بڑی بڑی روشن آنکھیں چلمن سے جھانک کر میرا بے چینی سے انتظار نہیں کر رہی ہوں گی۔ پاپا کے کمرے میں مؤکل ہوں گے وہ مقدمہ سلجھا رہے ہوں گے۔ ان کو کیا فکر لڑکا مرے یا جیے۔

تبھی میرا پرانا نوکر علی شیر مجھے ڈھونڈتا ہوا آگیا اور مجھے زبردستی گھر لے گیا۔ میں کمرے میں چپ چاپ پڑا رہا۔ میرے دوست مجھے کھیلنے کے لیے بلانے آئے لیکن میرا دل نہیں چاہا۔ دوپہر میں آم توڑنے بھی نہیں گیا۔ نوکر کھانا لاکر کمرے میں رکھ گیا، میں نے نہیں کھایا۔ میں روتے روتے سو گیا۔ اٹھا تو شام ہو چکی تھی میرا دماغ بوجھل تھا، کچھ کرنے کو طبیعت نہیں ہو رہی تھی۔ خالی بیٹھے بیٹھے گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔ بے چینی بڑھتی ہی جارہی تھی۔ جھک مار کر میں نے کورس کی کتاب اٹھائی، پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ کان میں کوئی پھسپھسایا۔ "دل لگا کر پڑھو، امتحان میں اچھے نمبر لانا۔"

"کون ہے بھئی؟" گھبرا کے کمرے میں دیکھا، میرے علاوہ کوئی نہ تھا۔ تو یہ بولا کون؟ کیا تم ہر جگہ ہو؟ کیا آوازیں بازگشت میں رہ جاتی ہیں؟

صبح میرا ارادہ دیر تک سونے کا تھا۔ لیکن پانچ بجے ہی تمھاری آواز نے مجھے اُٹھا

دیا — ''اٹھو دیر تک سونا اچھی عادت نہیں ہے۔'' میں مجبوراً اُٹھ بیٹھا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ تم کہیں نہیں تھیں۔ یعنی تم میرا پیچھا کبھی چھوڑو گی نہیں چاہے تم یہاں ہو یا نہ ہو، تم ہمیشہ میرے وجود میں ایک خوشبو کی طرح بسی رہو گی۔ جیسا تم چاہتی تھیں میں سارے کام ویسے ہی کرتا تھا۔ تمھاری غیر موجودگی میں بھی۔ میری سالگرہ کے دن بھی تم نے میری پیشانی چوم کر اٹھایا تھا — ''سالگرہ مبارک ہو۔''

''ارے...... تم کب آئیں؟'' میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

لیکن تم کہیں نہیں تھیں۔ تو پھر میری پیشانی کس نے چومی؟ ایک دم تمھاری طرح، لیکن کمرہ ہمیشہ کی طرح خالی تھا۔

شام کی ڈاک سے تمھارا پارسل ملا۔ تم نے مجھے زرد رنگ کا پل اوور بھیجا تھا۔ اچھا، تو تم کو یاد تھا کہ مجھے زرد رنگ بے حد پسند ہے۔ اس دن میں ببول کے درخت کے پاس گھنٹوں بیٹھا رہا۔ درخت اپنی بہار پر تھا۔ زرد زرد پھولوں سے ڈھکا ہوا ببول۔

میں پھول توڑتا تھا، تم اپنے کان کی لو میں پھول پہن لیتی تھیں ایک دن تم نے یہ شعر بھی پڑھا تھا:

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی
عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

تمھارے کہنے کے مطابق میں پڑھ لکھ کر انسان بن گیا۔ نوکری بھی مل گئی۔ پھر میں پیسے جوڑ کر تم سے ملنے لندن بھی آ گیا۔ تمھارے لیے کچھ لا نہیں سکا تھا، میں تمام دن دلّی کے پالیکا بازار میں گھومتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تمھارے لیے کیا خریدوں؟

تھک کر واپس کمرے پر لوٹ آیا تھا۔ کمرے میں میری نظر پڑی ایک پاؤڈر کے پرانے ڈبے پر۔ مجھے یاد آیا کہ میں بچپن میں پاؤڈر کے پرانے ڈبے میں شیشے لگا کر تمھاری ٹوٹی چوڑیوں کے ٹکڑے ڈال کر ایک کھلونا بناتا تھا، جس کو ہلانے پر چوڑیوں کے رنگین ٹکڑوں کے مختلف زاویے بنتے تھے۔ وہ تم کو بیحد پسند تھا، لیکن میں تم کو وہ کھلونا کبھی نہیں دیتا تھا۔ تمھارے لاکھ اصرار پر بھی نہیں بناتا تھا۔

میں نے بازار جاکر چند رنگین چوڑیاں لیں ان کو توڑ کر تمھارے لیے یہ ایک حقیر سا تحفہ تیار کیا۔

تمھارے گھر پہنچ کر مجھے فوراً یہ احساس ہو گیا کہ تمھارے علاوہ میرے آنے سے کوئی خوش نہیں ہوا تھا۔ خیر ...... مجھے امید بھی یہی تھی۔ حالانکہ تم بار بار یہی کوشش کر رہی تھیں کہ سبھی لوگ تمھارے بھائی کو تمھاری ہی طرح اہمیت دیں۔

کھلونا پا کر تم رو پڑی تھیں۔ لگتا تھا تمھارے سارے زخم پھر ہرے ہو گئے ہوں۔ گاؤں کی یادوں میں تم ڈوب گئی تھیں۔

''ببول کا پیڑ پچھواڑے ہے کہ نہیں؟''

''وہ کٹ گیا۔''

''ستروہن کی اماں آتی ہے کہ نہیں؟''

''وہ ہیضے میں کب کی مر گئی۔'' میں جھنجھلا گیا تھا۔ یہ بھی کہاں کہاں کی اوٹ پٹانگ باتیں پوچھتی ہے۔ لگتا ہی نہیں کہ لندن میں رہتی ہے۔

کھانا تم نے ہندوستانی پکایا تھا۔ میری پسند کی مکھانے کی کھیر بھی پکائی تھی، لیکن تمھارے شوہر اور بچوں نے چکھا بھی نہیں۔ ان لوگوں نے ڈبل روٹی اور سلاد کھائی۔ میں برسوں بعد تمھارے ہاتھوں کی پکی نرم، ملائم، نازک، ذائقے دار چپاتیوں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

تم مجھ سے اب بھی بالکل بچوں سا سلوک کرتی تھیں۔ صبح باقی بچوں کے ساتھ مجھے اٹھا دیتیں۔ میرے کپڑے دھوتیں۔ پریس کرتیں۔ میرے جوتوں کی لیس بھی ایک دن تم نے باندھنے کی کوشش کی تھی۔

''ارے بھئی میں خود باندھ لوں گا، تم مجھے بچہ مت سمجھا کرو پلیز۔''

''پپو! تم کتنے بھی بڑے ہو جاؤ میری نظر میں تو تم ہمیشہ بچہ ہی رہو گے۔''

اس کی آنکھیں جھل مل ہو گئیں۔ میں نے جوتے کے لیس اس سے بندھوائے۔ بچپن میں میں لیس غلط باندھ لیتا تھا۔ کبھی اُلجھا لیتا تھا۔ اس لیے وہ باندھتی تھی۔ تمھارے بچے ہنسے تھے۔ ''ماموں کو لیس بھی باندھنا نہیں آتا۔''

دوسرا بولا۔ ''گاؤں والے ہیں نا۔ اس لیے نہیں جانتے ہوں گے۔''

تم نے بڑے شوق سے ان کو وہ حقیر سا کھلونا دکھایا تھا جو تم کو بے حد عزیز تھا۔ لیکن تمھارے بچوں نے اس کو حقارت سے دیکھ کر کہا تھا:

''کیا وہاں ایسے ہی بیکار اور گندے کھلونے بنتے ہیں؟''

''ترقی ہوئی کہاں ہے وہاں۔'' تمھاری لڑکی بولی تھی۔

میں چپ چاپ نرم صوفے میں دھنسا جا رہا تھا۔

تم چپ تھیں، شرمندہ تھیں۔ تمھارے شوہر طنزیہ مسکرا رہے تھے۔ ان کے موٹے موٹے بھدے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ رہی تھی، لیکن میں — میں صرف تمھاری طرف دیکھ رہا تھا۔

کتنی کمزور ہو گئی تھیں تم۔ بالوں میں چاندی اُتر آئی تھی۔ عام لندن والوں کی طرح تم بال ڈائی نہیں کرتی تھیں۔ حالانکہ تمھارے شوہر کے بال ڈائی سے چمک رہے تھے۔

ببول کے پھولوں کی طرح تمھارا چہرہ زرد تھا اور میں اتنا مجبور تھا کہ تمھارے لیے کچھ کر نہیں سکتا تھا، چاہتے ہوئے بھی نہیں۔

میں نے تم سب سے اپنے دیش چلنے کو کہا تھا۔ تمھارے شوہر نے فوراً سوری کہہ دیا تھا۔ ''ہم لوگ تو بغیر ایئر کنڈیشن کے زندہ ہی نہیں رہ سکتے ہیں، ایک پل بھی نہیں۔ بچے بھی ان سہولتوں کے عادی ہیں۔ پھر گاؤں کی تکلیف دہ زندگی۔ یہ لوگ برداشت نہیں کر پائیں گے۔ بیمار ہو جائیں گے۔''

''اچھا جاڑوں میں چلیے۔'' تم نے خود سفارش کی تھی۔

''کھیتوں میں ہمارے گنا اور مونگ پھلیاں ہوں گی۔ بچے بھی خوش ہوں گے۔''

تمھاری آنکھوں میں سرسوں کے کھیت اُبھرنے لگے تھے۔ تم کنول کے تالابوں، مٹر کے پھولوں اور چنے کی تیز خوشبو سے ہو کر پھر لوٹ آئی تھیں۔

''جاڑوں میں ہم لوگ پیرس جا رہے ہیں کیوں؟'' تمھارے موٹے شوہر نے

بچوں سے کہا۔

”لیں۔“ سب چلائے تھے۔

”میں باجی کو لیتا جاؤں؟“ میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا تھا۔

میری بہن کے چہرے پر کیسی حیرانی، خوشی، غم، حسرت، مسرت کا ملا جلا جذبہ تھا جس کو بتانا مشکل ہے۔ لیکن تمھارے شوہر نے انکار کر دیا۔ اپنی بھاری بے سُری آواز میں فرمایا۔ ”گھر کے کاموں میں پریشانی ہو گی۔“

تم ایک لفظ بھی نہیں بولی تھیں۔ اُٹھ کر چلی گئی تھیں۔ مجھے معلوم ہے تم اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے خوب روئی ہو گی۔ گھر کے سارے کام مشین سے ہوتے ہیں اور اب تو بچے بھی بڑے ہو گئے ہیں۔ خود بھی کچھ نہ کچھ کر سکتے ہیں۔ لیکن میں کچھ کہہ ہی نہیں پایا۔

کھانے کی میز پر جب تم آئیں تو تمھارے ہاتھوں میں لرزش سی تھی اور آنکھوں میں ہلکی سرخی جو تمھارے غم کا ثبوت تھی۔

دوسرے دن مجھے وطن واپس آنا تھا۔ تم زندگی میں پہلی بار میرے شانے پر سر رکھ کر رات بھر روتی رہی تھیں۔ کیونکہ اس کے علاوہ تم کچھ کر بھی تو نہیں سکتی تھیں۔ کتنی مجبور تھیں تم اور میں......

کیا کرتا میں بھی۔ تم بتاؤ؟ میں نے کہا تھا۔ ”تم میرے ساتھ چلو اپنے گاؤں۔ اپنے دیش۔ چلو تم۔ میں تم کو لے چلتا ہوں۔ دیکھتا ہوں کون تمھارے بھائی کو روک سکتا ہے۔“

”نہیں بھیا۔ نہیں بھیا...... ’وہ‘ ناراض ہو جائیں گے۔“

’وہ‘ کم بخت ’وہ‘...... تم کو اپنے ’وہ‘ کا اتنا ہی خیال ہے۔ ان کی مرضی کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتیں تو بھول جاؤ ہم سب کو، ہم دیہاتی ہیں، جاہل ہیں، غریب ہیں۔ بھول جاؤ اپنے گھر کو، اپنے کھیتوں کو، اپنے لوگوں کو، کھو جاؤ یہاں کی رنگین فضا میں، ڈوب جاؤ مستیوں میں، بے ہنگم موسیقی میں، بے معنی زندگی میں۔ جہاں سب کچھ صرف پیسہ ہے۔ انسانی جذبات کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ کیوں جُڑی ہو تم ابھی

تک اپنی قدروں سے ؟"

"میری جڑیں تو وہیں ہیں بھیا...... میرا وجود بھی وہیں ہے، میری رُوح بھی وہیں ہے، صرف میرا جسم ہی تو یہاں آگیا ہے...... میں کیسے تم سب کو بھول سکتی ہوں ؟"

مجھے اپنے سینے سے لگایا تھا تم نے، میں ایک بچہ بن کر کاش تمھارے پاس تمام عمر رہ سکتا، کاش یہ لمحہ کبھی ختم نہ ہوتا۔ میں یوں ہی تمھاری آغوش میں سر رکھے رکھے مرجاتا۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ صبح سورج نکل آیا بلاوجہ ہی۔ میں چاہتا تو اور چھٹی لے کر رُک سکتا تھا، لیکن تمھارے شوہر کے چہرے پر میرے رہنے سے نفرت کا جو جذبہ اُبھرتا تھا وہ چاہے خود نہ پڑھ سکتا ہو لیکن ایک عام ہندوستانی ضرور پڑھ سکتا تھا۔ کیونکہ ہندوستان صرف دِلوں کا دیش ہے، جذبوں کا دیش ہے، محبت کا دیش ہے، خلوص کا دیش ہے۔

رات میں کئی بار میرے دل میں خیال آیا کہ میں تمھارے 'وہ' کی موٹی گردن اپنے مضبوط توانا ہاتھوں سے دبادوں، جب نیلی موٹی موٹی رگیں اُبھر آئیں تو چھوڑ دوں اور تم کو ہندوستان لے جاؤں۔ خود چاہے تمام عمر جیل میں رہوں، کم از کم اس فرعون سے دنیا تو پاک ہوگی۔

لیکن تمھیں بیوہ کیسے دیکھ سکوں گا؟ تم رنگین کے بجائے سفید ساڑی پہنو گی۔ تمھارے کانوں میں ببول کے پھول کی طرح زرد کرن پھول ہیں جو لماں کے جہیز کے ہیں، ان کو اتارنا پڑے گا۔ رنگین چوڑیاں تم کو بچپن سے بیحد پسند ہیں۔ میلہ جاتے وقت تم ہمیشہ مجھ سے چوڑیوں کی فرمائش کرتی تھیں۔ ہر رنگ کی چوڑیاں تھیں تمھارے پاس۔ تمھارے خالی سُونے ہاتھ کیسے لگیں گے؟...... نہیں...... نہیں...... میں تمھاری وجہ سے تمھارے 'وہ' یعنی فرعون کا خون نہیں کررہا ہوں۔

ایئرپورٹ پر بھی وہ موٹا اچھا ہوا مجھے چھوڑنے نہیں آیا۔ اس کو وقت نہیں تھا۔ صرف تم آئی تھیں۔ یہی میں چاہتا بھی تھا۔ چلتے وقت تم نے میری پیشانی چوم لی۔ ہاتھ میں چپکے سے صدقے کے روپے تھمادیے۔

میں جاکر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تم چلی گئی ہوگی۔ تم کپڑے دھو رہی ہوگی۔ کھانا پکا رہی ہوگی۔ تمھارے 'وہ' ٹی وی پر کوئی بلو فلم دیکھ رہے ہوں گے۔ تمھارے بچے ریکارڈ لگا کر کسی افریقی دھن پر ناچ رہے ہوں گے۔ تم میرے خیریت سے گھر پہنچنے کی دُعا کر رہی ہوگی۔

میں تمھاری یادوں کا خوشگوار بوجھ لے کر اپنی سرزمین پر آگیا ہوں — اور کھیتوں کو، گھر کو، ستر و بن کی اماں کو، بابا کو، کٹے ببول کے درخت کو تمھارا اسلام...... تمھاری عقیدت و محبت پیش کر رہا ہوں۔
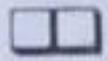
□□

بے دروازے کا گھر

اس کے اندر زندگی کی چاہت دم توڑ چکی تھی۔ جذبوں کی حرارت سرد ہو چکی تھی۔ انسان میں زندگی کی رمق ہو تو انسانوں سے اس کا ربط اس کا تعلق لازمی ہے۔ اس کے وجود میں تعلق، یقین اور اعتماد کے سارے چراغ بجھ چکے تھے۔ محرومیوں اور ناکامیوں کا گھنا اندھیرا چھایا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر جھلاّ پڑتی تھی۔ پتہ نہیں کیا ہوتا جا رہا ہے؟ وہ خود کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ ۳۰ سال کی عمر میں اس کے چہرے پر ۴۰-۴۵ سال کا گمان ہوتا تھا۔ وقت کے ہزاروں تھپیڑے سہتے سہتے اس کا چہرہ بے حس سا ہو گیا تھا۔

رات کے پچھلے پہر اس کی آنکھ اچانک کھل جاتی۔ جیسے کوئی پکار رہا ہو...... ”کون ہے؟“ اس کی چیخ خالی کمرے کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر لوٹ آتی۔ بچپن کی ہزاروں محرومیاں اور ہیبتناک ہیولے اس کے ذہن پر ہمیشہ طاری رہتے۔ سب سے الگ رہنے پر بھی وہ ان کی تکلیف دہ یادوں سے نجات نہیں پا سکی تھی۔

چھٹیاں شروع ہو گئی تھیں۔ ورکنگ وومن ہاسٹل خالی ہوتا جا رہا تھا۔ سبھی لوگ اپنے اپنے گھر جا رہے تھے۔ روز ہی کوئی نہ کوئی اس سے پوچھ بیٹھتا۔ ”تم کب جا رہی ہو؟“

”ابھی بہت مصروفیت ہے۔“ وہ ٹال دیتی۔ جان بوجھ کر وہ اپنے آپ کو مختلف کاموں میں اُلجھائے رکھتی۔ سبھی کو پتہ تھا کہ وہ کسی چھٹی میں کہیں نہیں جاتی۔ سارے تیج تہوار اس کے اسی خشک ماحول میں گزر جاتے تھے۔

پھر بھی یہ فضول سا سوال کیوں بار بار اس سے پوچھا جاتا تھا؟ گھر......... گھر لفظ اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ ایک چہار دیواری سے گھرا گھٹن بھرا ماحول لیے اجنبی چہروں اور بے گانی آوازوں سے آراستہ مقام۔ اگر اسی کو گھر کہتے ہیں تو اسے ایسے گھر کی کوئی تمنا نہیں تھی۔ حقیقت میں اس کا گھر بھی ایسا ہی تھا۔ محبت سے خالی گھر۔ کیا چہار دیواری کا نام ہی گھر ہے؟

بچپن سے اس کو ہاسٹل میں ڈال دیا گیا تھا۔ گو کہ وہ گھر کی سب سے بیکار شے تھی۔ پاپا کی دوسری شادی کی اکلوتی اولاد...... جس کے پیدا ہوتے ہی ماں کا انتقال ہو گیا۔ وہ گھر میں لاوارثوں کی طرح پڑی رہتی۔ اس کی ضرورت بھی کسی کو نہیں تھی۔ پہلی بیوی سے پاپا کے کئی بچّے تھے جو بڑی عمر کے تھے۔ وہ اس کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد پاپا نے اس کی امّی سے شادی کی تھی۔ عمر کا طویل حصّہ ہاسٹل کی نذر ہو گیا۔ وہ کالج کی چھٹیوں میں بھی گھر نہیں جاتی تھی کیونکہ اس کے لیے ان اجنبی چہروں کو برداشت کرنا مشکل تھا۔ اس کے سوتیلے بھائی بہن بڑے حسین اور دراز قد تھے۔ بڑی بڑی ڈگریاں لے چکے تھے۔ عمدہ عہدوں پر فائز تھے۔ ان کے مقابلے میں وہ صفر تھی۔ سیاہ رنگ جو اس کا مستقبل بن چکا تھا۔ منجھولا قد، معمولی ناک نقش، خوبصورتی کے نام پر اگر کچھ تھا تو اس کی چمکیلی سیاہ آنکھیں اور لمبے بال۔ لیکن چمکیلی آنکھوں میں جلد ہی اُجاڑ سناٹا بھر گیا اور ایک عجیب سی ویرانی نظر آنے لگی۔

لمبے بالوں میں وقت سے پہلے ہی سفیدی اُتر آئی۔ بچپن عمر سے پہلے ہی گزر گیا جیسے کوئی نرم و نازک پودا سہارے کے بغیر اور مناسب دیکھ بھال نہ ہونے سے مرجھا جاتا ہے، ویسے ہی اس کا کومل وجود مُرجھا گیا۔

گھر میں آنے والے مہمان یہی سوال کرتے۔ ''کیا یہ آپ کی بیٹی ہے؟''

اس کو اس سوال میں ہزار ڈنک محسوس ہوتے جو اس کے پورے وجود کو مجروح کر دیتے۔ وہ اپنے سوتیلے بھائی بہنوں سے ہر طرح سے جدا تھی۔ کھانے کی میز پر بھی وہ ان لوگوں کے ساتھ نہیں بیٹھنا چاہتی تھی، لیکن مجبوری تھی۔ پاپا سب بچوں

کے ساتھ ہی کھانا کھاتے تھے۔ سب بھائی بہن خوشی خوشی میز پر آدھمکتے اور چھین جھپٹ کر ہنسی مذاق کرتے ہوئے کھانا کھاتے جاتے۔ اس کو بھول کر بھی کوئی نہیں پوچھتا۔ نہ ہی کھانے کا کوئی پیالہ اس کی طرف بڑھایا جاتا۔ وہ زیادہ تر بغیر کھائے اٹھ جاتی کیوں کہ مانگنا اس کی عادت میں نہیں تھا۔

کمرے میں اکیلی پڑی پڑی وہ سب کے قہقہے سنتی رہتی۔ پاپا کے اصرار پر کوئی اسے بلا بھی لیتا تو وہ خاموشی سے بیٹھ کر سارا تماشا دیکھتی رہتی۔ کیا ضرورت تھی بھلا پاپا کو دوسری شادی کرنے کی؟ اتنے بڑے بڑے بچے تو تھے ہی۔ پہلی بیوی مر گئی تو کیا ہو گیا ایسا غضب۔ دوسری شادی کا گناہ اس کے سر ہی کیوں تھوپا جاتا ہے۔ کاش میں اپنی ماں کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی۔ کیا ضرورت تھی مجھے پیدا ہونے کی؟ ان سب کی نفرتوں کو برداشت کرنے کے لیے......

چھوٹے بھیا گٹار کے تار کستے رہتے۔ "بے بی ڈسکو، ڈسکو......"

"ارے اس کو بھارت ناٹیم سیکھنا چاہیے۔" منجھلی دیدی بھی چپ نہیں رہ سکتی تھیں۔

"کانونٹ ایجوکیشن ضروری ہے تمیز تہذیب کے لیے۔" بڑے بھیا غراتے۔

"پاپا نے اس کو ہندی میڈیم پڑھا کر ایک دم بلّلی بنا دیا ہے۔" بڑی دیدی ہنس دیتیں۔

پاپا کی حیثیت کسی سے چھپی نہ تھی۔ جب کاروبار چلتا تھا تب روپیوں پیسوں کی کمی نہ تھی۔ سب بچے کانونٹ اسکولوں میں پڑھتے تھے۔ سب پڑھ لکھ چکے تب وہ بلاوجہ پیدا ہو گئی۔ کاروبار ٹھپ ہو گیا۔ امّی کے انتقال کے بعد پاپا کا دل اُچاٹ ہو گیا۔ ان کا بڑھاپا اور جلدی آ گیا۔ وہ ہمیشہ سر جھکائے پریشان سے رہتے تھے۔ وہ چاہ کر بھی پاپا سے کچھ کہہ نہیں پاتی تھی۔

پہلے وہ چھٹیوں میں کبھی کبھی گھر بھی آ جاتی۔ اب وہ بھی بند کر دیا۔ کیونکہ سبھی بڑے بھائی بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ وہ لوگ اپنے بال بچوں سمیت ہر چھٹی میں پاپا کی بچی کھچی پونجی اُڑانے آدھمکتے اور اوپر سے طرّہ یہ کہ کہتیں "میں تو صرف دو

دن کے لیے آئی ہوں" کہتے کہتے دو تین مہینے کے بعد ہی ٹلتیں۔ سارے بچوں کے نئے کپڑے بنوائے جاتے۔ ہر فرمائش پوری کی جاتی۔ پھر بھی تسلی نہ ہوتی۔ ہر بات پر کہا جاتا — "میرے بچوں کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ میرے شوہر کو پاپا نے اس بار شرٹ کا کپڑا بہت معمولی قسم کا دیا۔ پاپا منجھولی کو زیادہ چاہتے ہیں۔ اس کے شوہر کی زیادہ آؤ بھگت ہوتی ہے۔ ہم کوئی گرے پڑے تھوڑی ہیں۔ چار دن کو میکے آئے ہیں تو یہاں بھی آرام چین نہیں۔" یہی جملہ منجھلی دیدی بڑی دیدی کے لیے کہتیں۔

پاپا یہ باتیں سن کر شرم سے کالے پڑ جاتے۔ بچے ہوئے پیسے جوڑ کر دعوت کا سامان منگانے لگتے، انھیں خوش کرنے کے لیے۔ بہنیں دل کی بھڑاس نکال کر پاندان کھولتیں اور مزے سے پان کا بیڑہ چبانے لگتیں۔ رمیا اماں لپک کر داماد کا پیر دبانے لگتیں۔ اسے اس ماحول میں سخت وحشت ہوتی۔ کیسی بیٹیاں ہیں جن کو اپنے والد کی بے کسی و غربت کا احساس نہیں ہے؟

گھر کی دیواروں پر لگے سنہرے فریموں سے لے کر ڈرائنگ روم کے قالینوں تک کی تعداد کم ہونے لگی۔ "پاپا یہ بہت گندا ہو گیا ہے شہر سے صاف کرا کر بھیج دیں گے" کہا جاتا اور وہ چیز ان کے گھروں کی زینت بن جاتی۔ دیوار گھڑیاں، پرانے گراموفون، جھاڑ فانوس، قیمتی لیمپ اور چاندی کے برتن سب دھیرے دھیرے کر کے غائب ہونے لگے اور چند سالوں بعد گھر میں صرف پھٹی دریاں چند چادریں اور ٹین کے ٹوٹے بکسے ہی بچے۔ پاپا نے بھی چپ رہنے کی قسم کھالی تھی۔

اس کی پڑھائی کا آخری سال تھا۔ اس نے ٹیوشن پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ منی آرڈر پاپا کو لوٹا دیا تھا۔ پڑھائی ختم کر کے وہ پاپا سے ملنے گئی تھی۔ "کیا ارادے ہیں آگے کے؟" بڑے بھیّا ہمیشہ کی طرح وِراج مان تھے۔

"آئی۔ اے۔ ایس میں بیٹھو۔" وہ جواب سننے کے بھی روادار نہیں تھے۔

اس نے پاپا سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔ "میں نے شہر میں ایک انٹر کالج میں نوکری تلاش کر لی ہے، ورکنگ وومن ہاسٹل بھی جوائن کر لیا ہے۔"

"اچھا......" پاپا نے مان لیا تھا۔

لیکن بڑے بھیّا جو خاندان کی ناک تھے، چپ کیسے بیٹھتے۔

''ارے...... یہ کون سا طریقہ ہوا۔ ہمارے خاندان کی لڑکی اور دو ٹکے کی نوکری۔ جتنی تنخواہ تمھیں انٹر کالج میں ملے گی، اُتنی تو میں اپنے نوکروں کو دے دیتا ہوں۔''

''لیکن اپنے والد کو کبھی ایک پیسہ دینے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔'' اس نے دل ہی دل میں بڑے بھیّا کو سنایا۔

''پاپا اس کی شادی کر دینی چاہیے اب۔'' وہ رُعب دار لہجے میں پاپا کی طرف مڑے۔

پاپا کا سر اور جھک گیا۔ بالوں میں سفیدی اور زیادہ چمکنے لگی۔ نگاہوں میں بے پناہ بے بسی تھی۔ ان کے پاس اب کچھ نہیں رہ گیا تھا اسے دینے کے لیے۔ وہ یہ بات کہہ نہیں پا رہے تھے۔ اس نے ان کی مشکل آسان کر دی۔

پہلی مرتبہ وہ بڑے بھیّا سے بولی تھی۔ ''میرے بارے میں اس گھر میں کسی کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنی زندگی اپنی طرح جینا چاہتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ جھٹکے سے اٹھ کر چلی گئی تھی۔

بڑے بھیّا کو اس جواب کی امید نہ تھی۔ پھر جو لڑکی صرف سننا جانتی تھی، بول بھی سکتی ہے۔ انھیں معلوم نہیں تھا۔

''بڑی بدتمیز ہو گئی ہے۔'' وہ غرّائے۔ لیکن کمرے میں ان کی غرّاہٹ سننے والا کوئی نہیں تھا۔ پاپا برآمدے میں خاموش اُداس کھڑے تھے۔ وہ اپنی کتابوں اور کپڑوں کا بیگ لے کر باہر آ گئی۔

''میں جا رہی ہوں۔'' اس نے پاپا کو چونکا دیا۔

''کبھی کوئی ضرورت ہو...... روپے پیسوں کی...... تو لکھ دینا۔''

''شکریہ...... اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ بھی کٹھور ہو گئی تھی۔ پاپا وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ وہ گیٹ تک اکیلی آئی تھی۔ اگر پاپا روک لیتے اسے تو شاید وہ رُک جاتی پر پاپا نے اسے روکا ہی نہیں۔ ایک اور بوجھ وہ بڑھانا نہیں چاہتے

تھے۔

کیوں مجھے پیدا کیا؟ کیا ضرورت تھی میری؟ پوچھنا چاہتے ہوئے بھی وہ نہیں پوچھ سکی تھی۔

پاپا کے خط آتے تھے۔ ”بڑی کے یہاں لڑکا ہوا ہے۔ ان کے شوہر آفس کے ٹور پر لندن گئے ہیں۔ منجھلی نے جاپانی کار نئے ماڈل کی خریدی ہے۔ اس بار اسی گاڑی سے آئی تھی مجھ سے ملنے۔ بڑے بھیّا کا پرموشن ہو گیا ہے...... چھوٹے بھیّا امریکہ جانے والے ہیں۔ ان کے بچّے دلّی کے اعلیٰ کالج......“

اس نے اوب کر ایک دن لکھ بھیجا۔

”مجھے صرف اپنے بارے میں لکھا کیجیے۔ دنیا بھر میں کون لوگ کہاں ہیں مجھ سے کیا مطلب ہے؟“

جواب فوراً آگیا۔ ”وہ تمھارے بڑے بھائی بہن ہیں۔“

پڑھ کر اسے ہنسی آئی۔ بہت زور سے قہقہہ لگانے کا دل چاہا لیکن قہقہہ لگا نہیں پائی۔ آنسوؤں سے گلا رُندھ گیا۔ یہ رشتہ اسے آج ہی معلوم ہوا تھا۔ اس سے زیادہ اہمیت تو وہ مالی کے دس سالہ لڑکے پپّو کو دے رہی تھی جو اس کے کمرے میں روز پھولوں کا گلدستہ دے جاتا تھا۔ تار آیا تھا ”پاپا بیمار ہیں۔“ وہ فوراً چلی گئی۔ پاپا کی آنکھیں انتظار میں تھیں شاید۔ اس کے پہنچتے ہی اسے دیکھ کر بند ہو گئیں۔ وہ خاموش چپ چاپ کھڑی رہی۔ بڑے بھیّا اور بہنیں چیخ چیخ کر بال بکھرا کر ماتھا پیٹ پیٹ کر زور شور سے رونے لگے۔ وہ اجنبی سی دیوار سے لگی کھڑی رہی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ پاپا مر ہی نہیں سکتے۔ اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ پاپا مر بھی سکتے ہیں۔

”اس کی آنکھوں میں باپ کے مرنے پر بھی آنسو نہیں ہیں؟ کیسی ہے یہ لڑکی؟“ بھیڑ میں کسی نے سرگوشی کی۔

اس نے اپنی پتھرائی آنکھوں سے گھوم کر دیکھا اور سر جھکا لیا۔ جاتے جاتے اس نے پاپا کی لاش سے چادر ہٹا کر دیکھا۔ کتنی جھرّیاں پڑ گئی تھیں چہرے پر۔ ایک ایک لمحے کا بوجھ ڈھوتے ہوئے وہ کتنا تھک چکے تھے۔ اچھا ہوا انھیں آرام مل گیا۔ ابدی

سکون۔ شمشان لے جاکر مجھے بھی پھونک دو پاپا کے ساتھ۔ کون ہے میرا اب..... اس دنیا میں؟

لیکن خاموشی کی صلیب اس کے ہونٹوں سے نہیں ہٹی۔

تیرہویں کے بعد وہ واپس لوٹ آئی۔ گھر میں کافی ٹینشن تھا۔ بھائی دونوں وکیل کے چکر میں آگے پیچھے گھوم رہے تھے۔ چند بیگھہ زمین کے لیے وہ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ بڑی دیدی کو دُکھ تھا کہ سب منجھلی لے کر چلی جائے گی۔ ایک ایک کپڑے اور برتن کا حساب رکھ رہی تھیں بڑی دیدی۔ بھابھیاں آپس میں اُلجھ رہی تھیں۔

برسی کا کارڈ آیا تھا۔ وہ گئی نہیں تھی۔ پتہ نہیں کتنے دھوپ بھرے دن سر سے گزر گئے۔ اس کے بالوں میں چاندی جھلملانے لگی۔ اسے احساس ہی نہیں ہوا۔

آج کالج سے لوٹتے ہی چونک پڑی تھی۔ ''آپ سے ملنے کوئی آیا ہے۔''

ہاسٹل کی دائی نے روک کر بتایا۔

''مجھ سے؟'' حیران رہ گئی تھی وہ۔

اتنے سال گزر گئے۔ آج تک تو کوئی ملنے نہیں آیا تھا اس سے۔

وزیٹنگ روم میں بڑے بھیّا بیٹھے تھے۔ وہ پہچان نہیں پائی تھی۔ کتنے بدل گئے تھے۔ تھکے تھکے سے لگے۔ شاید سفر کی تھکان تھی۔

''آپ کیسے آ گئے؟''

وہ بولے نہیں تھے۔ صرف اس کی معمولی سوتی کھادی کی ساڑی گھورتے رہے تھے۔ گھر میں انھوں نے صرف ریشمی کپڑے پہنے عورتوں کو دیکھا ہے، شاید اسی لیے۔

''یہ کیسے اُجاڑ سے قصبے نما شہر میں رہتی ہو؟'' ان کا لہجہ ابھی تک ویسا ہی تھا۔

''جہاں نوکری ملی وہیں ہوں۔'' اس کا لہجہ بھی تلخ ہو گیا۔

''بہت دُبلی ہو گئی ہو؟'' لہجہ سہل تھا۔

''نہیں تو۔ میں موٹی کب تھی؟'' اس کو ان کی ہمدردی کھل رہی تھی۔

یہ کیوں آئے ہیں ؟اس کے دل میں یہ سوال بار بار بچھو کی طرح ڈنک مار رہا تھا۔ان کو اب مجھ سے کیا لینا ہے ؟

پاپا بغیر وصیت لکھے ہی مر گئے تھے۔ میرے ہاتھ تو بالکل خالی ہیں۔ پھر یہ آئے کیوں ہیں......؟

ان کے بیچ فاصلہ پتھر کی دیوار سا بڑھتا جا رہا تھا۔

"کالج سے آئی ہو۔تھکی ہو۔منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔" انھوں نے ہی بیچ کا سناٹا توڑا۔

وہ خود بھی بھاگنا چاہتی تھی۔ منہ دھو کر سیدھے میس پہنچی اور چائے لے کر وزیٹنگ روم میں لوٹی۔ بڑے بھیّا اخبار پڑھ رہے تھے۔

"فلم...... کون...... کونسی دیکھ چکی ہو؟" چائے لیتے ہوئے انھوں نے پوچھا تھا۔

"فلم......؟" وہ اپنی گھسی ہوئی کولھاپوری چپل دیکھنے لگی۔

کیا انھیں میری معاشی حیثیت کا اندازہ نہیں ہے یا جان بوجھ کر مجھے نیچا دِکھا رہے ہیں؟

بول پڑے تھے وہ "چلو پھر چلتے ہیں کوئی بھی فلم دیکھ لیں گے، تمھارا شہر بھی دیکھ لیں گے۔"

اتنے سہل کب سے ہو گئے ؟اسے حیرت تھی۔

شاید ضروری تھا اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھنا پڑا تھا۔ "بھابھی اور بچّے اچھے ہیں؟" اس کی زبان تالو سے چپکنے لگی تھی۔ یہ پوچھتے پوچھتے۔

"تمھاری بھابھی اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولے تھے۔ ان کی شخصیت میں جذباتیت کا کوئی مقام نہیں تھا۔ یہ بات وہ جانتی تھی۔ وہ صرف ان کو دیکھتی رہی کچھ کہہ نہیں پائی تھی۔

"بچّے ہاسٹل میں ڈال دیے ہیں۔" گہری پُراسرار خاموشی پھر چھا گئی۔ "تم نے گھر سے نکل کر کبھی خبر ہی نہیں لی۔"

لیجیے پھر سارا الزام اس کے سر تھوپ دیا گیا۔ فلم دیکھ کر وہ شہر میں گھومتے رہے۔

ایک بڑی دکان پر رُک کر انھوں نے ریشم کی نفیس ساڑی خرید لی۔ بھابھی نہیں رہیں، اب کس کے لیے؟ اس کے اندر خیال نے سر اٹھایا لیکن پوچھا نہیں۔ ضرورت بھی کیا تھی ان کے کسی معاملے میں بولنے کی۔ کھلے ریسٹورنٹ میں کافی پیتے ہوئے انھوں نے کہا۔ ''پتہ نہیں تم کو یاد ہے کہ نہیں، آج تمھاری سالگرہ ہے۔ اس لیے تمھارے لیے ساڑی خرید لی۔''

''میرے لیے کیوں؟'' اس کا لہجہ ترش ہو گیا۔

تیس سال بعد آج ان کو میری سالگرہ کیوں یاد آئی؟ کیا مجھ کو ذلیل کرنا چاہتے ہیں کہ میں ریشمی ساڑی تک نہیں خرید سکتی۔

''تمھاری سالگرہ ہے اور میں تمھارا بڑا بھائی ہوں۔'' وہ مسکرانے کی کوشش کر رہے تھے۔

''یہ رشتہ آپ کو بہت جلدی یاد آیا۔''

اس کے لہجے کی تلخی سے وہ گھبرا سے گئے۔ کافی کی پیالی ان کے ہاتھ میں کانپ گئی۔ وہاں سے اٹھتے وقت انھوں نے اسے کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے ساڑی کا پیکٹ خود ہی اٹھا لیا۔

وہ تیزی سے آگے آگے چل رہی تھی۔ وہ وزیٹنگ روم میں چلے گئے تو وہ دوڑ کر اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

یہ احسان کا بوجھ اس سے ڈھویا نہیں جا رہا تھا۔ باتھ روم میں جی بھر کر رونے کے بعد وہ نکل کر آئی تو ہاسٹل کی دائی نے بتایا۔ ''صاحب جا چکے ہیں۔ آپ کو یہ لفافہ دے گئے ہیں۔''

وہ ٹھگی سی کھڑی رہی۔ لفافہ کھولنے کی ہمت نہیں تھی۔

روبی!

شاید کوئی حق نہیں رکھتا ہوں۔ اس لیے صرف روبی لکھ رہا ہوں۔ یہ کاغذات ہیں پاپا کے گھر کے، جو اَب تمھارے نام ہے۔ چاہنا تو لوَٹ آنا۔ میں ہری دوار جا رہا ہوں۔ بہت تھک چکا ہوں بھاگتے بھاگتے، زندگی کے ساتھ۔

چھوٹے بھیا، بڑی دیدی، منجھلی دیدی سب غیر ملکوں میں بس چکے ہیں۔ شاید ہی کبھی لوٹیں۔ میں گھر کی چابیاں ہی دینے آیا تھا، لیکن ایک عجیب سی جھجک کی وجہ سے کہہ نہیں سکا۔ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

بڑے بھیا لکھ کر انھوں نے کاٹ دیا تھا۔ لفافے کے ساتھ ساڑی کا پیکٹ بھی تھا۔ اس نے ساڑی کے پیکٹ پر سر رکھ دیا اور اب اس کی آنکھوں کا سیلاب رُک نہیں رہا تھا۔

□□
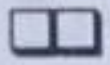
اُجیل پاک اندھیر پاک

''اب کی پھاگن ما جب اُجیل پاک پڑی ہے تو 'اُو' اویا ہے۔'' چند نیا نے اپنے سفید سفید موتیوں جیسے دانت جھلملاتے ہوئے مسکرا کر ایک بار پھر اعلان کیا۔ اس کے اعلان کو سنتے ہی بڑی اماں نے بیزاری سے پاندان کا ڈھکن زور سے بند کیا اور ہاتھ میں سروتا اٹھا کر اندر والے کمرے میں چلی گئیں۔ ان کے تخت سے ٹکی بیٹھی بلکہ آدھی پسری سی چند نیا کے چہرے کی وہ چمک بھی انھوں نے نہیں دیکھی جو اس کے پکے گہرے سانولے رنگ کی خوبی تھی۔

وہ دیکھتی بھی بھلا کیوں؟ کہ چند نیا جس کا نام کبھی چاندنی رہا ہو گا، ہر دوسرے مہینے ہی اپنے 'اُو' کے آنے کی خبر سناتی تھی۔ اس کا 'اُو' بمبئی جیسے بڑے شہر کے سمندر میں لوگوں کی بھیڑ کے درمیان گم ہو چکا تھا۔ چند نیا سے شادی کرنے کے بعد ہی وہ اس کو چھوڑ کر چلتا بنا تھا۔ اس بات کو تقریباً چھ سات سال گزر چکے تھے۔ پہلے کبھی کبھار تیج تہوار پر وہ چند نیا کو منی آرڈر سے تھوڑا بہت روپیہ بھیجتا تھا لیکن اب تو عرصہ ہوا یہ سلسلہ بھی بند ہو چکا تھا۔ کوئی کھوج خبر نہیں۔

وہ اب لوٹ کر کبھی آئے گا بھی یا نہیں...... کسی کو کیا پروا تھی...... لیکن چند نیا کو یقینِ کامل تھا کہ اس کی بے لوث محبت یوں بے اثر نہیں جا سکتی۔ اس کا 'اُو' ایک نہ ایک دن ضرور لوٹ آئے گا۔

چند نیا اتنی بھولی تھی کہ اس کو دنیا کی تاریخ و جغرافیہ کا کچھ بھی پتہ نہ تھا۔ حد تو یہ تھی کہ اسے مہینوں اور دِنوں کے نام بھی پتہ نہ تھے۔ اس لیے وہ اپنے 'اُو' کے

آنے کی تاریخ دِنوں مہینوں میں نہ جوڑ کر اُجیل پاک اور اندھیر پاک یعنی چاندنی اور اندھیری راتوں کے حساب سے جوڑتی تھی۔

ویسے شاید کچھ جاننا کچھ نہ جاننے سے زیادہ تکلیف دِہ ہے۔ سب کچھ جاننے کے لیے ہی تو انسان بوکھلایا رہتا ہے اور سب کچھ جان کر حاصل ہوتی ہے بے چینی۔ ایک اور تلاش...... جستجو...... خلش......

چندنیا بھی اسی دنیا کی باسی تھی، لیکن ہر چیز سے الگ۔ اسے تو بمبئی اور دلّی تک میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے لیے تو سارے شہر ایک جیسے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ ایک بہت بڑا سا شہر ہوگا جس میں سبھی شہر والے رہتے ہوں گے۔ اسے تو بس یہ پتہ تھا کہ بڑے صاحب اور چھوٹی بٹیا شہر میں رہتے ہیں اور 'اُو' بھی شہر میں رہتا ہے۔ اس لیے وہ چاہتی تھی کہ بڑے صاحب اس کے 'اُو' کو سمجھا بجھا کر ڈانٹ لگا کر گاؤں واپس بھیج دیں۔ میں نے اسے لاکھ سمجھایا کہ چندنیا ہم لوگ دلّی میں رہتے ہیں اور تمھارا 'اُو' بمبئی میں رہتا ہے۔ اور دونوں شہروں کے بیچ ہزاروں میل کا فاصلہ ہے، لیکن اس کی بھینس جیسی عقل میں یہ بات آتی ہی نہیں تھی۔ وہ تو بس اپنے آپ میں مگن رہتی تھی۔ تپتی تیز دھوپ بھری دوپہر میں گھاس کا گٹھر سر پر لادے آنگن میں آکر کھڑی ہو جاتی۔ اس کے ماتھے پر محنت کا پسینہ ہیرے کی کنی کی طرح چمکتا ہے۔ دھوپ میں اس کے پیتل کے جھمکے جھلمل کرتے ہیں۔ اس کے سرسوں کا تیل چپڑے بال دمکتے ہیں اور صحت مند ہاتھ پیر زندگی کی للک میں جھٹ پٹ سارا کام منٹوں میں نپٹا دیتے ہیں۔ کتنی زندہ دل ہے یہ مزدور لڑکی۔ اسے رتّی برابر اپنی محرومیوں کا احساس نہیں ہے۔ فکر ہے بس اپنے 'اُو' کی۔

میری اور اس کی دوستی بھی اتفاق سے ہوئی۔ ہوا یوں کہ میں ہمیشہ کی طرح جاڑوں کی چھٹیوں میں ابا کے ساتھ بڑی اماں سے ملنے دیہات آئی تھی۔ سال میں ایک بار ابا دیہات ضرور آتے تھے، اپنی اماں سے ملنے اور شہر کی تیز رفتار زندگی سے سکون پانے۔ ان دِنوں میں دلّی میڈیکل کالج میں پڑھ رہی تھی اور مجھے دیہاتی گنوار عورتوں سے سخت چڑ تھی۔ ان کے پاس سے اٹھتی ایک عجیب سی بو سے تو میرا سر

چکرا جاتا تھا۔ گود میں بھنکتے روتے ناک ٹپکاتے، رال بہاتے بچوں کو لیے دیہاتی عورتوں کو دیکھ کر مجھے نفرت آتی تھی۔

ہمارے کھیتوں میں مزدوری کرنے والی چندنیا اور دوسری عورتیں اکثر ہمارے گھر آتی تھیں اور بڑی اماں کے دالان میں بچھے بڑے سے تخت کے پاس بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کرتی تھیں۔ بڑی اماں بھی ان کی باتوں میں دلچسپی لیتیں اور اکثر پاندان سے تمباکو یا ڈلی نکال کر ان کو دیتیں۔ ساتھ ہی ان کے دُکھ درد سن کر مشورے بھی دیتی جاتیں۔ میں دالان کے آخری سرے پر آرام کرسی پر دراز کوئی دلچسپ کتاب پڑھتی رہتی۔ دور سے ہی گاؤں والیوں کے سلام کا جواب سر ہلا کر دے دیتی۔ کسی کی ہمت بھی نہ پڑتی کہ شہر میں لڑکوں کے ساتھ 'داگدری' پڑھ رہی، انگریزی بولنے والی چھوٹی بٹیا سے کوئی بات کرنے کی کوشش کرتا۔ ہاں کبھی کبھی دو ایک ڈھیٹ قسم کی عورتیں میرے قریب آ بھی جاتیں تو میں سر جھکا کر کتاب کے صفحے پلٹتی رہتی۔ جب اور قریب آجاتیں تو میں کتابوں میں نظریں گڑا لیتی اور جب وہ بالکل ہی نزدیک آجاتیں تو میں چپ چاپ اُٹھ کر وہاں سے چلتی بنتی۔

چندنیا سے بھی ایک سنہری جاڑے کی صبح میں ملاقات ہوئی۔ میں اپنی آرام کرسی میں دھنسی انگریزی کا ایک موٹا ناول پڑھنے میں مصروف تھی۔ دھوپ بھی اس دن ہلکے گرم دوشالے سی نرم بکھری تھی۔ سارے گھر میں گاجر کا حلوہ بننے کی تیز خوشبو پھیل رہی تھی۔ بڑی اماں باورچی خانے میں خانساماں کو دوپہر کے کھانے کے بارے میں تاکید کر رہی تھیں۔ ابا شکار کھیلنے گئے تھے۔ میری کرسی کے قریب ایک پرچھائیں آکر ٹھہر گئی۔ حلیے سے لگا کہ یہ چندنیا ہی ہوگی۔ ادھر کئی دِنوں سے یہ میرے قریب گھسنے کی کوشش میں لگی تھی۔ وہ کوئی بات پوچھتی تو میں کافی ترشی سے ہاں یا نہیں میں جواب دے کر بات ختم کر دیتی۔ لیکن وہ پھر بھی میری کرسی کے پاس آکر کھڑی ہو جاتی۔ میری بے رُخی کا اس پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا تھا۔

چندنیا کافی دیر خاموش کھڑی رہی۔ میں نے بھی جان بوجھ کر ناول سے نظر نہیں اٹھائی۔ قریب آدھا گھنٹہ اسی خاموشی میں گزر گیا۔ میرا دل ناول سے اُچاٹ

ہو گیا۔ ایک تپسوی کی طرح چندنیا اٹل کھڑی تھی۔ عاجز آکر میں نے کافی درشتی سے پوچھا۔ "کیوں؟ کیابات ہے؟"

اس نے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھادیے۔ ہری ہری نرم شاخوں کے بیچ سے ہرے چنے مسکرا رہے تھے۔ اچھا تو اس نے یہ بھی پتہ لگالیا کہ مجھے ہرے چنے بے حد پسند ہیں اور خانساماں ناشتہ میں خاص کر میرے لیے ہرے چنے کھیت سے تڑوا کر رکھتا ہے۔

میرے دل پر اس کی معصوم محبت کا اثر ہوا اور مجھے اپنی نفرت پر تھوڑی سی شرمندگی ہوئی۔ میں نے لہجے میں نرمی لا کر کہا۔ "اچھا ٹھیک ہے، یہ خانساماں کو دے دو۔" پھر بھی وہ اسی طرح ہاتھوں میں چنے لیے کھڑی رہی۔ اس کی ضد کے آگے مجھے جھکنا پڑا اور اس کے ہاتھوں سے میں نے چنے لے لیے۔ یوں ہوئی تھی ہماری دوستی کی شروعات۔ پھر تو وہ تقریباً روز ہی آتی اور یوں کئی سال گزر گئے۔ میرا میڈیکل کا آخری سال تھا اور ہمیشہ کی طرح جاڑوں کی چھٹیوں میں میں اور ابا بڑی اماں سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ اب بڑی اماں بھی بہت ضعیف اور کمزور ہو گئی تھیں۔ ان کی محبت بھی کچھ اور ہی بڑھ گئی تھی۔ خود تو ان سے اب کچھ کام ہوتا نہیں تھا لیکن نوکروں سے طرح طرح کے پکوان پکوا کر ہماری خاطریں کیے جا رہی تھیں۔

چندنیا پھر وارد ہو گئی اور مجھ پر ہمیشہ کی طرح نذرانے چڑھا رہی تھی۔ کبھی سنگھاڑے توڑ لاتی تو کبھی میٹھے بیر۔ کبھی مکھن سمیت مٹھا لے آتی تو کبھی تازہ تازہ گنے کا رس لیے چلی آتی۔ لیکن اب اس کے سانولے رنگ میں گہرا پن آچکا تھا۔ ہنستی بھی اب کم تھی۔ پہلے تو اس کی بتیسی ہی کبھی بند نہیں ہوتی تھی۔ سفید جھک دانت، موتیوں کی آب لیے قطار وار۔ میں نے ایک بار پوچھا بھی تھا۔ "تو اپنے دانت کاہے سے صاف کرتی ہے؟"

"نیم کی داتون سے۔" وہ بناکا والی مسکان دے کر بولی تھی۔ لیکن اب اس میں بڑی عجیب سی تبدیلی آگئی تھی، جو اس پر قطعی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ ایک دن وہ بڑی چپ چپ دیر تک میرے پاس بیٹھی رہی۔ میں نے ہی کہا "کچھ بولو نا چندنیا؟"

"ایک بات پوچھے کا ہے چھوٹی بی بی۔" اس نے بڑے مرجھائے لہجے میں کہا۔

''ہاں پوچھو۔''میں نے بھی موڈ میں آکر کہہ دیا۔

''بی بی جی کا سہر ماسب ہے لڑکیاں گور ہوت ہیں؟''

''کیوں؟''میں ہنسنے لگی۔''یہ تم نے اس قدر بے تکا سوال کیوں پوچھا؟''

اس نے شرما کر کہا۔''گاؤں بھرے ماسب کہت ہیں کہ 'او' تم کا سہر یہی لیے نہیں لے جات کہ تم کریا (کالی) ہو۔ اوہاں 'او' کوؤ گورر کھے ہے جانو۔''

''نہیں تو...... ایسا بالکل نہیں ہے۔ پھر تم خود اتنی پیاری ہو۔ تمھارا رنگ کالا تھوڑی ہے، سانولا ہے۔ چمکیلا سانولا...... ہزاروں گوروں سے کہیں زیادہ خوبصورت ہو تم...... معلوم ہے تم کو...... تمھارا رنگ ہی اصلی ہندوستانی رنگ ہے۔ ایسا رنگ پانے کے لیے گورے انگریز گھنٹوں ساحل کی ریت پر ننگے بدن پڑے رہتے ہیں۔ اور جب تم ہنستی ہو تب تو اور بھی اچھی لگتی ہو...... یہ گاؤں والے بے وقوفی کی باتیں کرتے ہیں ان پر مت جاؤ۔ تمھارا 'او' ضرور آئے گا...... بھلا تم کو چھوڑ کر وہ کیسے رہ سکتا ہے؟''

میرے لکچر کو سن کر اس کے کان لال ہو گئے تھے اور وہ 'دھت' کہہ کر چھم چھم پایل بجاتی ہوئی بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔

آخر وہ دن بھی آگیا جب میری چھٹیاں ختم ہونے پر آگئیں اور ہم لوگ واپسی کے لیے تیاری کرنے لگے۔ بڑی اماں ہمارے ہمراہ کرنے کے لیے چاول، گڑ، چوڑا، تل کے لڈّو اور انڈے کا حلوہ وغیرہ بندھوانے لگیں۔ تبھی چندنیا بے حد افسردہ سی آنگن میں داخل ہوئی۔ میں نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔''کیا بات ہے چندنیا؟ چہرہ کیوں اُترا ہوا ہے؟ بیمار ہو کیا؟''

''نا ہی تو۔' کہہ کر وہ پیروں کے پاس بیٹھ گئی اور نیم کے تنکے سے زمین پر آڑی ترچھی لکیریں بنانے لگی۔

''کوئی دوائی ہے کا؟''وہ بدبدائی۔

'کا ہے کی؟''میں نے جھلا کر پوچھا۔''عجب عورت ہو تم بھی۔ کہتی ہو بیمار نہیں ہو پھر دوا بھی چاہیے...... تمھیں آخر ہوا کیا ہے چندنیا؟''

”چھوئی بی بی! تم داگدری پڑھت ہو...... سب جانت ہو...... ہم کا اس دوائی دئی دو کہ ’اُو‘ ہمکا چاہے لاگے۔“

”چاہے لاگے......“ مجھے اس کی بدعقلی پر زور سے ہنسی آئی اور مجبوری و بے کسی پر شدت سے رونا آیا۔

میں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”چندنیا بھلا ایسی دوا کیسے ہو سکتی ہے کہ جس کو کھا کر کوئی کسی کو چاہنے لگے۔ ایسا ہوتا تو سب ہی ایسی دوا کھاتے۔“

”چھوٹی بی بی...... تم ہمکا ایس دوائی پلائی دو...... چاہے ہمار سب گہنا پاتار ہن رکھائے دو......“ وہ میرے قدموں پر اپنا سر پٹخنے لگی۔ میں بے حد گھبرائی۔ تبھی خانساماں لپک کر میرے پاس آگیا اور چندنیا کو ڈانٹنے لگا۔ ”چل اُٹھ...... مری جات ہے اُو کے لیے...... اُو کا کچھ اَتا پتا ہے؟ کا کرہے اُو نرموہی کی یاد ما پگلی بن جائے...... چل اب گھر جا۔“

چندنیا تھکی سی لٹی لٹی سی گھر کی سمت چل پڑی۔

تب خانساماں نے مجھ کو بتایا کہ چندنیا نے اپنے ’اُو‘ کو پانے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے۔ پیر، فقیر، پنڈت، ملاّ، سبھی آزما ڈالے۔ شیو کے مندر میں کئی رات بھوکی پیاسی پڑی رہی۔ رات دن پوجا کی، برت رکھے، گنگا میں ساری رات ایک ٹانگ پر کھڑی ہو کر بھی دیکھ لیا، جنتر منتر، جادو ٹونا، تعویذ، گنڈے سب کرا ڈالے۔

دوسرے دن ہم لوگوں کی روانگی تھی۔ تانگے پر ابا بیٹھ چکے تھے۔ مجھے بڑی اماں امام ضامن باندھ رہی تھیں کہ چندنیا آگئی۔ خاموش دیکھتی رہی سب کو۔ بڑی اماں نے اس کی خاموشی توڑنے کے لیے چٹکی لی۔ ”کیوں ری...... تیرا ’اُو‘ اب کی اُجیل پاک میں آرہا ہے نا؟“

”اُو اب کوؤ اُجیل پاک نہ اندھیر پاک ما ایہے...... اُو اب کبھو نہ ایہے۔“ اس نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

اس کے سرد لہجے کی برچھی سبھی کے دل میں اُتر گئی اور پوری فضا میں اُداسی چھا گئی۔

☐☐

نیک پروین

''عقد نکاح کنیز فاطمہ عرف شاہین رضوی بنت سیّد سلطان حسین صاحب رضوی ساکن حیدر گنج لکھنؤ ہمراہ سیّد شبیر حسین رضوی سلمہ عرف سیّد ذیشان عالم رضوی سلمہ ابن سیّد ریاست حسین صاحب (مرحوم) ساکن بیرونی خندق لال ڈگی روڈ، علی گڑھ بعوض مہر معجّل مبلغ چودہ ہزار روپیہ رائج الوقت کہ نصف جس کا مبلغ سات ہزار روپیہ سکۂ رائج الوقت ہوتا ہے۔ آپ کے وکیل کی حیثیت سے پڑھوں؟ آپ کی اجازت ہے؟''

''ہوں۔'' میں نے گھبرا کر کہہ دیا۔ فضا مبارکباد کے شور میں ڈوب گئی اور میں ایک نئے شہر نئی دنیا میں پہنچ گئی۔

مگر افسوس میرے محلّے کی سبھی عورتیں جھوٹ بولتی ہیں۔ ذیشان جب مجھ سے بیاہ رچا کر اس محلّہ میں آئے تو سبھی عورتوں نے میری منہ دِکھائی دیتے وقت میری جھوٹی تعریف کی۔ حالانکہ میں خوبصورت نہیں تھی لیکن چونکہ شادی کے وقت میری عمر اٹھارہ سال سے بھی کم تھی اس لیے کم عمری کا حسن تھا۔ بال میرے سیاہ اور دراز تھے۔ میرے میاں کو پسند بھی تھے اس وقت۔ (بعد میں نے کٹوا دیے ایکدم چھوٹے چھوٹے مردانے قسم کے۔)

عورتوں نے مجھ کو بہت ساری نصیحتیں دے ڈالیں۔ جیسے ہی ذیشان دفتر سدھارتے کئی بڑھیاں اور ادھیڑ عمر کی عورتیں گھر میں داخل ہو جاتیں۔ میں چائے بناتے بناتے اور دروازہ کھولتے بند کرتے تھک جاتی۔

مجھے کھانا پکانا نہیں آتا تھا۔ نہ ہی شوق تھا گھر پر میرے خادمہ تھی وہی سارے کام کرتی تھی۔ محلّہ کی عورتوں نے مجھ کو مشورہ دیا کہ میاں کو خوش رکھنا ہے تو اچھے اچھے طرح طرح کے مزیدار کھانے پکانا سیکھ لوں۔ یہ عورت کا خاص گُر ہے۔ (اس سے میاں بندھا رہتا ہے، کھونٹا چھوڑ کر بھاگتا نہیں)

میں نے مر کھپ کر کسی طرح بیکنگ، چائنیز، مغلئی، انڈین اور کانٹی نینٹل کھانے پکانے کی کلاسیں اٹینڈ کیں۔ موٹی رقم بھی خرچ کی اور تھوڑا بہت سیکھ بھی گئی۔ روز مرّہ کے گھریلو کھانے محلّہ کی عورتوں کے سر پر ہر وقت کھڑے رہنے سے ہی سیکھ گئی۔ ہاتھ کئی بار کٹا اور چھالے بھی پڑ گئے۔ دور سے اُچھال کر تیل میں پوری ڈال دیتی تو کبھی بگھار کے لیے پیاز پھینکتی اور تیل تمام ہاتھوں پر...... کئی بار تو کم بخت کو کر ہی آ کر چپک گیا۔ میاں نے منع بھی کیا۔ ہوٹل میں بھی کھلا دیا، لیکن عورتوں نے سخت منع کیا۔ "روپیہ برباد مت کرو میاں کو پٹانا ہے تو......" وغیرہ وغیرہ...... خیر بھئی ہم باورچن بن گئے۔

چار چھے میاں کی قمیصیں اور اپنی کچھ قیمتی ساڑیاں جلانے کے بعد دھوبن بھی بن گئے۔ گھر سجانے اور صاف کرنے کا شوق تھا لیکن جیوں جیوں گھر کو میں نفاست و نزاکت سے سجاتی گئی۔ میاں نے کچھ دُوری اختیار کر لی۔ شادی کو بھی چھ ماہ گزر چکے تھے۔ میں نے سوچا شاید اس لیے ہی ایسا ہوا ہے۔

یہ دیر رات کو دفتر سے گھر آنے لگے۔ عورتوں نے کہا۔ بچّہ آ جائے گھر میں تو رونق ہو۔ میاں وقت سے گھر آنے لگیں گے۔ چند ماہ بعد میں نے بچّے کی خوشخبری میاں کو دی تو وہ گھبرا گئے۔

"ارے بھئی...... ابھی اتنی جلدی؟"

میں خود نروس ہو گئی اپنی غلطی پر۔ رات کو انھوں نے سمجھایا۔ "یہ معاملہ ابھی ختم کر دو۔ تمھاری عمر کم ہے۔ تم انٹیریئر ڈیکوریشن کا کورس کر لو۔ تم کو شوق بھی ہے۔" میں معاملہ سمجھ گئی۔ میں نے جی توڑ محنت کر کے انٹیریئر ڈیکوریشن کا کورس

کرلیا۔ اب اپنے گھر کے بجائے دوسروں کے گھر سجانے لگی۔

عورتوں نے کہا۔ ”تم اب ہنستی نہیں ہو پہلے کی طرح۔ شاید اسی لیے شوہر تمھارا صبح بہت جلدی دفتر چلا جاتا ہے۔“

اب میں بلاوجہ ہنسنے لگتی۔ یہ پوچھنے بھی لگے۔ ”تم یہ یکا یک بات بے بات ہنسنے کیوں لگی ہو؟“

میں ہنس دی۔ (اصل بات چھپا گئی) یہ آئے دن ٹور پر جانے لگے۔

”اب بچہ آجانا چاہیے۔“ کئی بوڑھیاں فکر مند ہوگئیں۔ بچہ آگیا۔ ان کو بچے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرا کام بڑھ گیا۔ انھوں نے ایک آیا رکھ دی۔

”تم مائیکے چلی جاؤ کچھ مہینوں کے لیے تاکہ تم کو آرام مل جائے۔“

میں مائیکے چلی گئی۔

آٹھ مہینے گزر گئے تو وہاں سب نے کہا۔

”اب تم میاں کے پاس جاؤ وہ بچے کے بغیر بے چین ہوگا۔“

حالانکہ وہ بچے سے اتنا ڈرتا تھا کہ ہاتھ لگاتے گھبراتا تھا۔

”یہ بہت چھوٹا ہے۔“ اور رونے سے تو اسے سخت چڑ تھی۔ رات میں وہ ڈرائنگ روم کے صوفے پر سونے لگا۔ بہانہ کرتا کہ ”رات میں بچہ روتا ہے اُٹھ کر تو میری نیند خراب ہوتی ہے۔“

خیر شکر تھا وہ سوتا صوفے پر ہی تھا اور محلہ والوں کو بیڈ روم میں ہی ڈبل بیڈ نظر آتا تھا۔

ایک رات وہ رات بھر نہیں لوٹا۔ لوٹا تو تھکا ہوا تھا۔ آتے ہی سو گیا۔ جب دوپہر میں اُٹھا تو میں پہلی بار لڑی۔ کہا ”بچہ سخت بیمار تھا۔ ڈاکٹر کے پاس لے جانا تھا اور آپ رات بھر نہیں آئے۔“

”بچہ تمھاری ذمہ داری ہے، تم نے پیدا کیا ہے اپنی خوشی سے۔ میں نے تو منع کیا تھا۔“ وہ صاف پلا جھاڑ گیا۔

"اچھا کھلاتا پلاتا ہوں تم کو اور کیا چاہیے؟" میں جل کر چپ رہی۔

اب دھوبی کو کپڑے دیتے وقت اس کی پینٹ کی جیب سے طرح طرح کی عریاں تصویریں اور بیہودہ مضمون کی کترنیں ملنے لگیں۔

صوفہ کے نیچے سے فحش میگزین، کلپ اور بال، لپ اسٹک کے نشان لگے رومال وغیرہ ملنے لگے۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔

وہ خود ہی ایک دن اپنی ٹائپسٹ کی بے شمار تعریفیں کھانا کھاتے کھاتے کرنے لگا۔ "وہ بڑے لذیذ بھرواں کریلے پکاتی ہے۔"

یہ کریلے نہیں کھاتے تھے۔ میں نے اگلے دِن بھرواں کریلوں کی ترکیب مسز رنجیت سے لی اور رات کے کھانے میں پکائے۔

انھوں نے چھوئے بھی نہیں۔ بچہّ رات بھر چیختا رہا۔ میرا دِل اچھی ہاؤس وائف بننے سے ایکدم اکتا گیا۔

اب میں دیر تک پڑی سوتی رہتی۔ محلّہ کی عورتوں کے کہنے کے مطابق میں صبح جلدی اٹھنے لگی تھی۔

"میاں کو خوش رکھنا ہے تو اس کے سونے کے بعد سوؤ اور اُٹھنے کے پہلے اُٹھو......" یہ بار بار عورتیں کہتیں۔ میں نے سچ مان لیا تھا۔

میاں نے کہا۔ "تم موٹی ہو رہی ہو۔" میں نے ڈائٹنگ شروع کر دی۔ بی۔ پی۔ لو کر لیا۔ چہرہ لٹک گیا۔ بال جھڑ گئے۔

میاں اب روز ہی دیر میں آتے۔ کافی جلدی جاتے۔ لنچ کا جھنجھٹ ہی نہیں رہا۔

میں نے کھانا پکانے کے لیے بوا رکھ لی۔ کئیوں نے اعتراض کیا۔ "میاں بیوی بچہّ، دو جنوں کا کھانا نوکرانی کیا پکائے گی؟ چرائے گی زیادہ۔" وہ چور تھی۔

میں جانتی تھی لیکن کام کرتے کرتے تھک چکی تھی۔ بور ہو چکی تھی۔

یہ اب گھر میں بھی پینے لگے۔ یار دوست گھر آنے لگے۔ پہلے میں خوب

خاطریں کرتی تھی۔ اب میں بچّے کے ساتھ بیڈروم میں چلی جاتی۔

سلام دعا کر کے ناشتہ بھیج دیتی۔

"تم بداخلاق ہو گئی ہو۔" یہ غرّاتے۔

میں چپ رہتی۔

میں نے غصّہ میں اکسرسائز بند کر دی، جو اُن کے مشورے کے مطابق شروع کر دی تھی۔ اور خوب کھانے لگی۔ میری کمر کمرہ ہو گئی لیکن چہرے کی چمک لوٹ آئی۔ بالوں میں جان آ گئی۔

بچّہ بھی موٹا ہو رہا تھا۔ محلّہ کی عورتیں خوش تھیں۔ یہ کچھ پریشان تھے ان دِنوں۔ میں نے پوچھا تو بولے۔ "معاشی دقتیں ہیں۔"

ایک دن بازار میں اپنی نئی تحقیق کے ساتھ شاپنگ کرتے ہوئے مل گئے۔ بوکھلا گئے اچانک۔

"تم یہاں کیسے؟ بچّہ کہاں ہے؟"

میں نے آئس کریم کا بڑا کون سوتتے ہوئے ہنس کر کہا۔ "پڑوسن کے یہاں دے آئی ہوں۔ آج اس کا کریچ دیکھنے نکلی تھی۔ سوچا کافی دِن سے آئس کریم نہیں کھائی ہے۔ کھالوں۔"

"تمھارا گلا خراب ہو جائے گا، ڈاکٹر راحت آج کل باہر گئے ہیں۔" ان کو میرے گلے کی فکر لاحق ہونے لگی۔

میری نظریں اس کی نازک گردن کا طواف کر رہی تھیں جس میں ایک چمکیلی نئی سنہری چین جگمگا رہی تھی۔

انھوں نے گھبرا کر کیش میمو نیچے گرا دیا۔

"مجھے دفتر میں دیر ہو رہی ہے ایک میٹنگ ہے آج۔"

یہ اس بلا کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔

کیش میمو دو ہزار کا تھا۔

میں دھاروں دھار روئی بے ہوش ہوئی۔ پھر خوب لڑی۔ ہزاروں گالیاں دے ڈالیں۔ خوب اُلٹا سیدھا کہا۔ گریبان پھاڑ ڈالا۔ وہ خاموش سنتا رہا۔ آخر کار میں خاموش ہو گئی۔ عورتوں نے بتایا۔ عورت کو مرد کی زیادتیوں پر خاموش رہنا چاہیے۔ یہی نیک عورت کا چلن ہے اپنے شوہر کی برائی کرنے والی عورت سماج میں رُسوا ہوتی ہے۔ شوہر کی نظروں میں گرتی ہے اور عاقبت میں بھی کوئی جنت کے محل کا دروازہ نہیں کھلتا۔

میں نے ہار کر خاموشی کی سیاہ عبا اوڑھ لی۔ وہ بہت خوش تھا۔ یوں وہ بے چین رہتا۔ عجیب قسم کی بے چینی۔ وہ وحشت سے پاگل ہوا جاتا۔ جب تک وہ نیا پتھر پگھلانے میں مصروف رہتی۔ جب پگھل جاتا تو عجیب سا سرور اس پر طاری ہو جاتا۔ وہ سیٹیاں بجاتا اور عجب انداز سے مسکراتا۔ اس کی عیار آنکھیں جگمگاتیں۔

اب مجھے بھی پتہ چل جاتا۔ جب کوئی نئی کلی اس کی زندگی میں آتی وہ اچانک بے حد مہربان ہو جاتا مجھ پر۔ بڑے والہانہ ڈھنگ سے کہتا۔

''تم تو بڑی نیک ہو۔'' (جی تو چاہتا اس کا منہ نوچ لوں۔)

''اگر زندگی رہی تو اگلے سال سونے کا گلوبند بنوادوں گا۔''

(کمینہ...... اللہ کرے مر جائے)

مجھے روٹھتا دیکھ کر کہتا۔ ''چلو تم کو آئس کریم کھلادوں۔'' (بدذات)

''کیوں نہ آج ہوٹل میں ڈنر لیں؟'' وہ کھکھیاتا۔

دل میں تو آتا ہزارہا گالیاں دوں اور اپنی چوڑیاں توڑ ڈالوں اور رنڈاپا اوڑھ لوں۔

لیکن ایسا کچھ نہ کرپاتی میں۔ ہر حال میں مجھے اس کے ساتھ ہی رہنا تھا۔ ایک چھت کے نیچے۔ ہزاروں جوڑوں کی طرح بے بس اور بے حس۔ زندگی کی تمام نرمی اچانک خشک ہو گئی۔ اب تمام رشتے اپنی رمق اپنے معنی کھوتے جا رہے تھے۔ میں عجب قسم کی ناقابل بیان کیفیت کے ٹرانس میں تھی۔

تمام تعلقات بے کیف ہو چکے تھے۔ بے مزہ، نمک ختم ہو چکا تھا۔ زبان پر ایک پھیکا سا ذائقہ...... نمک کہاں کھو گیا؟

پتہ ہی نہیں چلا۔ بس چپ چاپ اچانک زندگی سے غائب ہو گیا۔ کیسے؟ نامعلوم۔ بھیانک اکیلا پن تھا۔ ایکدم گھپ اندھیرا۔ ساتھی تھا...... لیکن نہیں تھا...... کچھ یاد نہیں......

دن رات بازاروں میں گھومتی بے تحاشا شاپنگ کر ڈالتی۔ کئی ساڑیاں، بلاؤز، سوٹ، نائٹی بلاوجہ ہی خرید ڈالے۔ فیشل ایک ہی ماہ میں کئی بار کروا ڈالا۔

شہر شہر گھومی...... لاحاصل......

ڈھیر سارے گملے خرید لائی۔ کھودتے کھودتے اپنی قبر تک پہنچ جاتی۔ ننھا سا گڑھا غار نما نظر آنے لگتا۔ پھر قبر میں تبدیل ہو جاتا۔ میں سفید کفن پہن کر اندر چلی جاتی...... بیج بو کر باہر آ جاتی...... شاپنگ کرتے کرتے ہوٹلنگ کرتے کرتے میں تھک جاتی۔ وہ جس بھی شہر میں جاتا گھر کو سجانے کا سامان اٹھا لاتا۔

گھر سامان سے بھر گیا۔ میرا دِل مر گیا۔ اس کا دل جوان تھا۔

جیوں جیوں وہ بوڑھا ہو رہا تھا، اس کے قہقہے دن بدن جوان ہو رہے تھے۔

کئی بار خود کشی کی بھی کوشش کی۔ مگر ناکام رہی۔

ہر بار میاں نے ہی مجھے بچایا۔ خیر یہ بات ہم دونوں کے بیچ ہی رہی۔ "اللہ کی دی حسین زندگی یوں ضائع نہیں کرتے۔ خوش رہا کرو۔ ہنسا کرو۔ اپنے کو مصروف رکھو۔ نماز پڑھو۔ کلام پاک کی تلاوت کرو۔ اس سے جی بہلتا ہے اللہ مہربان ہوتا ہے۔ بچے میں جی لگاؤ۔ اچھی ماں بنو۔ صبح اُٹھ کر ٹہلا کرو۔ اپنے کو فٹ فاٹ رکھا کرو یار......"

اس کے جوتے سے لے کر بال تک چمکتے وہ فیشن ایبل کپڑے پہنتا۔

میں نے اس شخص کو اس شدّت سے چاہا کہ شاید ہی کسی عورت نے کسی مرد کو چاہا ہوگا۔ میں اس کو اس قدر چاہتی تھی کہ وہ بور ہو گیا۔ ہزار بار کہہ چکا تھا "مجھے اتنی

شدّت سے نہ چاہا کرو۔ میں اکتا جاتا ہوں۔" جب وہ سو جاتا تو رات رات بھر میں شمع لے کر اس کا چہرہ تکتی رہتی۔ سچ مجھے وہ دنیا کا سب سے حسین انسان لگتا۔ (حالانکہ وہ حسین نہیں تھا) ایک عجب قسم کی دیوانگی مجھ پر سوار تھی۔ وہ بھی چاہتا تھا لیکن ایک حد رکھ کر۔ شاید ایک ساتھ یا ایک پر ہی سب کچھ خرچ نہیں کر دینا چاہتا تھا۔

میں نے نیک پروین بننے کی بے حد کوشش کی۔ کامیاب بھی رہی۔ لیکن وہ ہاتھ سے نکل گیا۔

میں بے حد چاہنے کے ساتھ ساتھ شدید نفرت بھی کرنے لگی۔ ایک ساتھ دونوں جذبے مجھ پر بری طرح حاوی تھے۔ محبت کے مارے میں اس کے غلیظ موزے تک سونگھتی اور پسینے میں بھیگی بنیان اپنے تکیے پر رکھتی جب وہ نہ ہوتا تب۔ اور اکثر راتوں کو وہ نہ ہوتا۔ اس کی کار باہر کھڑی رہتی تاکہ محلے والوں (بلکہ والیوں) کو معلوم نہ ہو۔ دنیا کا اتنا ڈر تھا اس کو۔ پارٹیوں میں مجھ کو سجا دھجا کر لے جاتا۔ کپڑے بنوا دیتا۔ میک اَپ کا سامان لا دیتا۔ اس معاملے میں اس کی معلومات بڑی وسیع تھی۔

عجیب قسم کا ذلیل و کمینہ شخص تھا۔ میں روتی تو وہ اُٹھ کر سب سے پہلے گھر کے دروازے کھڑکیاں بند کرنے لگتا۔ ہاتھ پیر جوڑنے لگتا۔ "خدا کے لیے مت رو...... لوگ تمھارا رونا سنیں گے تو میرے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے؟"

اپنے بارے میں وہ ہر لمحہ اچھی رائے قائم کروانا چاہتا تھا۔ محلے، سماج، دنیا و خدا سے ڈرتا لیکن کرتا وہی جو وہ چاہتا۔ اور مارے نفرت کے میں اس کے پسندیدہ آفٹر شیو لوشن اور سینٹ ایک ساتھ ملا کر کاک ٹیل بناتی اور فلش میں ڈال دیتی۔ اس کی پسندیدہ شراب کی بوتلوں کو توڑ ڈالتی۔ وہ کچھ نہ کہتا۔ خاموش رہتا۔

لیکن رات میں سوتے سوتے اس کے ماتھے کی رگ اتنی تیزی سے پھڑکنے لگتی کہ میں چونک جاتی۔ وہ بے قرار رہتا۔ اس کے منہ سے اکثر کوئی نام خود بہ خود نکل جاتا۔ بعض وقت یوں ہی وہ ذکر کر دیتا پری وشوں کا پھر "ساری" کہہ کر ایک عجب بے چارگی سے آنکھوں میں معصومیت بھر لیتا کہ پل بھر میں نفرت کافور ہو جاتی اور

پھر میں اچھی بیوی بننے کی کوشش کرنے لگتی۔ میں ماں نہیں بن سکی۔ بچہّ ضرور پیدا کرلیا، لیکن میرے اندر ماں بننے کا جذبہ ہی نہ پیدا ہوسکا۔ نفرتوں کی وجہ سے وہ مرگیا۔

بعض عورتیں بغیر اولاد پیدا کیے ہی ماں بن جاتی ہیں۔ ممتا کا جذبہ اتنا حاوی ہوتا ہے۔ میں ماں ہو کر بھی ماں نہیں تھی۔ بچہّ میں ضرور پال رہی تھی لیکن میرے اندر اس کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں تھا۔ ایسے بچےّ شاید زیادہ ہی سمجھدار ہوتے ہیں۔ ننھا سا بچہّ مجھے دیکھ کر ہنستا تو لگتا مذاق اُڑا رہا ہے۔ وہ روتا نہیں تھا۔ یا تو کھیلتا یا چپ چاپ کریچ (Creche) چلا جاتا۔ شاید وہ میرا راز جانتا تھا کہ میں ماں ہو کر بھی...... میرے اندر کی نازک کونپل کھلنے کے پہلے ہی مرجھا چکی تھی۔ یہ بھی نر بچہّ ہے۔ بڑا ہو کر یہ بھی ویسا ہی ہوگا جیسا اس کا باپ ہے۔ پھر بھی اس کے باپ کو میں شدّت سے چاہتی اور بے پناہ نفرت بھی کرتی۔ یہ دونوں جذبے ایک دوسرے پر اوور لیپ (Over-lap) ہوتے رہتے۔

عورتیں بتاتیں کہ شوہر بھی طرح طرح کے ہوتے ہیں۔ بس برانڈ نیم الگ ہوتے ہیں۔ بل ڈاگ (Bull Dog) جرمن شیفرڈ (German Shepherd)، السیشن (Alsation)، پاکٹ ڈاگ (Pocket Dog)، گرے ہانڈ (Grey Haund)، پامیرین (Pomerain)، فاکس ٹیریر (Fox Terrior)، ڈابر مین (Doberman)، لیبراڈور (Labrador) دیسی...... ان کو سختی سے باندھ کر رکھو۔ نہیں تو موقع ملتے ہی یہ ادھر اُدھر منہ مارنے لگتے ہیں۔

لیکن وہ جب میرے پاس ہوتا تب بھی میرے پاس کہاں ہوتا تھا؟ اس کی آواز کہیں اور ہوتی، جسم کہیں اور ہوتا۔ ذہن کہیں اور ٹہل رہا ہوتا۔ آنکھیں سمندر پر ہوتیں تو زبان نمکین، چٹپٹے، میٹھے، ترش ذائقے تلاش کررہی ہوتی۔ ایک نہ ایک عورت ہمیشہ اس پر حاوی رہتی۔

لاشعوری طور پر اس کی گتھیاں اُلجھی رہتیں۔ اس کے ذہن میں ہمیشہ کوئی اور

ہو تا...... وہ جڑا رہ کر بھی مجھ سے جدا تھا۔ ساتھ ہوتا تب بھی لگتا کہ بیچ میں کئی لوگ اور ہیں۔ وہ کبھی اکیلا ہوتا ہی نہ......

میں نے کیا نہیں کیا اس کو خوش کرنے کے لیے...... گرمی کی تپتی دوپہروں میں گیس ختم ہونے پر بھی اس کے لیے جلتے آنگن میں کاغذ جلا جلا کر چائے بنائی۔ سرد راتوں میں اُٹھ کر اس کو بھوک لگنے پر کھانا پکایا۔ اس کو اپنے ہاتھوں سے کھلایا بچّوں کی طرح نوالے بنا بنا کر۔ اس کی ہر خواہش پوری کی۔

پھر بھی وہ بے وفا نکلا اور میرا یقین محبت پر سے اُٹھ گیا۔ تمام جذبے مردہ ہو گئے اور دل ریگستان بن گیا اور میں اپنے بچّے کی ماں نہ بن سکی۔

آشرم کی چر کنواری موٹی گروجی کہتیں۔ ''مایا سے بچو۔ پریم مایا ہے۔ اس کا جال جھوٹا ہے۔ کوئی نہ اپنا نہ پرایا۔ مکت ہو جاؤ بندھن سے...... '' عقیدت سے تمام عورتیں سر جھکا لیتیں۔ میں بھی مکرَ سادھ لیتی۔ آنکھ کھولتی تو گروجی کی چیلی ان کو تلے کاجو کھلاتی نظر آتی...... مایا سے......

''آپ اُداس کیوں ہیں؟'' ایک کمسن لڑکی نے بیٹھی ہوئی بھیڑ میں سے پرچی سرکائی تھی۔ میں نے ارد گرد کی خاموشی دیکھی تھی۔ اپنا نوٹوں بھرا بیگ کنارے کر کے رومال تلاش کیا تھا اور اس کو پرچی لوٹاتے ہوئے مسکرا دی تھی۔ سب مایا ہے...... سب جڑ ہے......

جتنا میں اس کے قریب جانے کی کوشش کرتی رہی وہ دُور ہوتا رہا۔ تمام کامیاب نسخے ناکام ثابت ہوئے۔ وہ میری دُوری سے خوش ہوتا۔ میں مائیکے جانے کا نام بھی لے لیتی تو وہ ناچ اٹھتا۔

''اللہ تم کتنی اچھی ہو۔ اپنا خیال رکھنا...... آرام سے رہنا...... آئیں؟ کوئی جلدی نہیں ہے۔ اطمینان سے آنا...... وہاں تو تمھارا دِل لگے گا نا؟'' اور میں دور ہٹنے لگی۔ اس کی خوشی بڑھنے لگی۔

''سب کچھ تو ہے تمھارے پاس عورت کی طرح رہو۔'' (شاید مجھے عورت کی

طرح رہنا ہی نہیں آیا۔)

یوں عورتوں والی تمام کمینگی مجھ میں بھی تھی۔ جلن، حسد، نفرت، گھٹن شروع کے دَور میں میں نے خوب جاسوسی کی۔ بٹیروں کی قسمیں پتہ کیں۔ اس کی پتوں کی ڈائری چھپادی۔ لیکن کمپیوٹر کی طرح اس کے ذہن کی فلاپی میں ہزاروں پتے، فون نمبر سالگرہ کی تاریخیں درج تھیں۔

خوب نمازیں و نفلیں پڑھیں۔ روزے رکھے۔ قرآن حفظ ہو گیا۔ ہزاروں سورے یاد ہو گئے۔ وہ اپنا نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ تعویذ گنڈے سب بے اثر......

''دل کو وسیع کرواپنے۔'' وہ سمجھاتا۔

''سب سے محبت کیا کرو......'' وہ ہنستا۔

لو جی۔ دل نہ ہوا کبوتر خانہ ہو گیا۔ جس کے ہر خانے میں ایک عدد (لڑکی......؟)

مجھے پوری چاکلیٹ چاہیے تھی۔ غلطی یہی تھی کہ مجھے شیئر کرنے کی عادت نہیں تھی۔ نہ کوئی رشتہ نہ سامان۔ یہی گانٹھ تھی۔ ہزاروں ٹکڑوں میں بٹی چاکلیٹ کا مزہ کسیلا ہو جاتا ہے میری زبان پر۔ بچپن سے عادت تھی پورا چاکلیٹ کھانے کی۔

گھر میں چھوٹی ہونے کا نقصان یہی رہا کہ کوئی حصہ بانٹ کرنے والا نہیں تھا۔ سب کچھ اکیلے ہی لینا تھا سکھ......دُکھ...... لیکن یہ تو وہ چاکلیٹ تھا جو......

رات میں اکثر زیادہ پی لینے کے بعد معافیاں مانگتا۔ تب اچانک اس کا ضمیر جاگ اٹھتا۔ شکل مسکینوں جیسی بنالیتا۔ ایکدم معصوم بن جاتا۔ قدموں پر سر رکھ دیتا اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتا۔ ملول آواز میں کہتا۔

''میں تم کو کوئی خوشی نہ دے سکا۔''

''نہیں...... نہیں...... تم بہت نیک ہو......'' میں فوراً سارے گناہ معاف کر دیتی اور شرمندہ ہو جاتی اپنی زیادتیوں پر۔

اپنے گناہوں کو بخشوانے کی منتیں کرتا اور میں ہر نماز میں اس کے لیے دعائیں مانگتی۔ مسجدوں، امام باڑوں اور درگاہوں میں اس کے گناہ بخشوانے پہنچ

جاتی۔

اکثر جی چاہتا کہ کلیجے میں چھپالوں۔ بعض اوقات میں ماں بن جاتی اس کی۔ بہن بن جاتی۔ محبوبہ بن جاتی۔ ہزار ہا روپ نکل آتے۔ پھر ہم دوست بن جاتے۔ کبھی کبھار میاں بیوی بھی بن جاتے۔ لیکن چند دِنوں بعد پھر وہی...... کتے کی دُم ٹیڑھی والا حساب...... جو کبھی سیدھی نہیں ہو سکتی۔ لاکھ کوشش کرلو، ویسے کی ویسی ہی رہتی ہے۔

قرآن ہاتھ میں لے کر جھوٹی قسمیں کھا جاتا۔ ایسے ایسے بہانے تراش لیتا کہ عقل حیران رہ جاتی۔

اب میں اکثر چپ بھی رہ جاتی۔ کچھ کچھ انسانی دوستی بھی ہو گئی تھی اس سے۔ رشتہ بدل سا گیا تھا۔ وہ مجھے بتانے لگا تھا کہ ''فرح تھوڑی موٹی ہے لیکن آنکھیں جھیل کی طرح پر سکون اور گہری نیلی ہیں موہنی کے دانت...... سروج کے لبِ لعلیں...... کانتا کے بال سنبل...... انجلی کی زبان میٹھی ہے۔ سادھنا سے صرف فون پر ہی بات کرلو تو سکون مل جائے۔ اب اتنی دوڑ بھاگ کے پر آشوب دَور میں ذرا سا سکون تو سبھی چاہتے ہیں نا؟ تم سمجھ رہی ہو نا؟ روٹین لائف سے آدمی بور ہو جاتا ہے نا اس لیے ذرا سی تبدیلی......''

میری عقل موٹی ہے باریک باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ اس لیے میں سو جاتی۔ حالانکہ وہ جلد ہی بور بھی ہو جاتا۔ پھر نئی تلاش نئی جستجو شروع ہو جاتی وہ ایک جگہ پر بیٹھنے والا پرندہ تھا ہی نہیں۔

بہت کلوز (Close) پارٹیوں میں وہ اپنی نئی ڈسکوری کو بھی لے جاتا اور دوستوں پر رعب مارتا۔

میرے چڑچڑانے پر کہتا۔ ''تم کو طلاق تو نہیں دے رہا ہوں نا؟'' میں گھٹ کے رہ جاتی۔ جی تو چاہتا میں خود ہی ایسے شخص کو طلاق دے دوں۔ لیکن بنوَ تو جائے گی کہاں؟ اس سماج میں جہاں کنواری اور طلاق شدہ لڑکیوں کی حالت ایک جیسی ہے، جو

کہ بغیر کوئی گناہ کیے ہوئے بھی گنہگار مانی جاتی ہیں۔ طلاق شدہ عورت؟ نہ......نہ...... نہ...... کبھی جی چاہتا بھاگ جاؤں یہ جنجال چھوڑ کر لیکن تحفظ کا احساس ہی کافی تھا۔

"پریکٹیکل بنو۔ وقت کے ساتھ چلنا سیکھو......"

اب لڑکیوں سے مجھے بھی ملوانے لگا۔ اکثر دیر رات میں آئے فون تھما دیتا۔

"سنو......لڑکیاں کیا کیا کہتی ہیں......مجھے کتنا پیار کرتی ہیں......"

بڑا گمان تھا اس کو اپنی مردانگی کا۔ حیرت ہوتی مجھے لڑکیوں کے منہ سے اس طرح کی باتیں سن کر۔

چند لڑکیاں مجھے اچھی بھی لگیں۔ میں ان کی آپا و باجی بھی بن گئی۔ چند وقتِ رخصتی اتنا روئیں کہ میرا دِل سمندر کی تلہٹی میں چلا گیا۔ اور میں نے بڑی منتیں کیں کہ "آپ ان میں سے کسی کے ساتھ تو ایماندار رہیے۔ آپ جس سے چاہیں شادی کرلیں۔ مجھے اعتراض نہیں ہو گا۔ بس آپ خوش رہیے۔ اسی میں میری خوشی ہے۔"

"لعنت بھیجو۔" وہ میری بیوقوفی پر بے تحاشا ہنستا اور کہتا کہ "میرے بیٹے کا کیا ہو گا؟ تم کو اندازہ ہی نہیں ہے ابھی......یہی تو میری نسل بڑھائے گا۔ (وہ بیٹا جس کی شکل وہ کبھی کبھار ہی دیکھتا تھا)

"سماج میں میری عزّت ہو تم وہ میرا بیٹا ہے......"

یہ خدا کس طرح میرا ساتھ دے رہا ہے؟ جی چاہتا کہ نہ ساتھ دے تو ہی اچھا ہے۔ ہاں لڑکی کی جدائی اس سے برداشت نہ ہوتی۔

لڑکی چھوڑتے وقت بے حال ہو جاتا۔ اتنا درد تو مجھے بچہّ پیدا کرنے میں نہیں ہوا تھا جتنا اسے لڑکی چھوڑنے میں ہوتا۔ بے تحاشہ روتا۔ گھنٹوں اُداس رہتا نہ کھاتا نہ پیتا۔ میں اس کو پھر سے زندہ کرنے کی کوشش میں بے جان ہو جاتی۔ چند دن وہ نارمل رہتا پھر دوسرا دورہ شروع......مجھ سے کہتا "مسکراتی رہا کرو۔ ہنسا کرو۔ یہ کیا منہ بنا کر بیٹھی رہتی ہو۔ پکچر دیکھا کرو۔ گھومنے جایا کرو۔ سج کر رہا کرو۔"

میں چینی کی گڑیا کے مانند سج سنور کر بیٹھی رہتی۔ مسکراتی رہتی۔ آئینے میں

میرا چہرہ اتنی پرتوں سے ڈھکا نظر آتا کہ پھر لگتا کوئی دوسرا ہی چہرہ ہے میں تو کھو گئی ہوں۔ گمشدہ ہوں۔ اگر میرے گھر سے کبھی کوئی آجاتا تو وہ گھبراتا۔

''اپنی اماں بہنوں سے ہرگز کچھ مت کہنا۔ کہنا میں دفتر میں بے حد مصروف ہوں۔'' میں وہی کہتی جو وہ کہتا۔ حالانکہ سبھی میرے چہرے کی مسکان کے اندر کی اُداسی سمجھ جاتے۔ میرے قہقہے کھوکھلے ہو جاتے پھر بھی میں ہنسنے کی لگاتار کوشش کرتی رہتی۔

وہ مسکین و مظلوم شکل بنالیتا۔ آنسو ٹپکنے لگتے۔ سانسیں تیز تیز چلنے لگتیں اس کی۔ پل بھر میں فریادی بن جاتا اور پل بھر بھی نہ گزرتا کہ قاتل بن جاتا۔ بے حس اور بے رحم سنگ دل ایکدم پتھر سا......

آدمی اتنا مکاّر کیسے ہو جاتا ہے مجھے یقین ہی نہ آتا......

آرسی مصحف میں رکھا آئینہ یاد آجاتا جب پہلی بار ان کی شکل اس میں دیکھی تھی۔ ایکدم معصوم۔ حیرت سے اُداس آنکھیں ایک ٹک مجھے آئینے میں دیکھ رہی تھیں۔

انسان کے اندر کتنے غار چھپے ہیں؟ کتنے روپ......

اَن گنت رنگ...... سب لاحاصل...... لاجواب......

ایکدم ملمع اُترنے لگا۔ پرت در پرت۔ چہرے سے چہرے اترنے چڑھنے لگے۔ عجیب و غریب مکھوٹے جانوروں اور انسانوں کی ملی جلی شکلیں...... ایک عجب شیطانی شکل گھورنے لگی۔ حرص و ہوس میں ڈوبی شیطانی آنکھیں...... رنگت سیاہ...... اللہ اللہ...... ہیبت طاری ہو جاتی...... کال بیل بجی۔ دُودھ اُبل کر گر گیا۔ گیس بجھ گئی۔ گیس کی مہک پورے گھر میں پھیل گئی۔

''تم کہاں تھیں؟'' یہ حیران و پریشان۔

(پتہ نہیں) ''یہیں تو تھی......'' میں جلدی جلدی دُودھ صاف کرنے لگتی۔ کوکر پتیلی سب جلا کر سیاہ کر ڈالے۔ ٹی وی کا سوئچ خراب۔ پریس سے کپڑے جل جاتے۔ واشنگ مشین میں کپڑے پھنسا ڈالے۔

''دماغ کہاں رہتا ہے تمھارا؟'' یہ پوچھتے۔

"پتا نہیں۔ "میں شرمندہ......

اس کا دل بڑی جلدی اکتا جاتا۔ کسی بھی چیز سے خاص طور پر اپنی غذا سے۔ وائٹ میٹ (White Meat) سے بھرتا تو ریڈ میٹ (Red Meat) ڈھونڈ لیتا۔ تلاش جاری ہی رہتی ہر پل۔

وہ موڈ میں ہوتا تو مزے لے لے کر سناتا۔ الگ الگ ذائقے، لذّت، لطف، حسن کے داؤ پیچ بیان کرتا۔ عجب تھا وہ......

"وہ قلمی آم کی طرح شیریں ہے تو وہ تخمی آم کی طرح ترش وہ میک ڈونل کا برگر ہے تو دوسری پزّا (Pizza) اور جو ہی دیسی مزا ہے ارہر کی دال۔ چاول اور کمرخ کی چٹنی کی طرح...... شوبھا سرسوں کے ساگ جیسی۔"

پھر اچانک چپ ہو جاتا۔ "او ساری......!"

میری آنکھوں کے کھنڈر اسے ڈرانے لگتے۔ (میرے اندر کی بھتنی ہنسنے لگتی) لڑکیوں میں پوری طرح انوالو (Involve) ہوتا تھا۔ پورا کردار ان کا اپنے اوپر طاری کر لیتا۔ ان کی ہر خواہش کا احترام کرتا۔ ان کی پسند، ان کی ناپسند، لپ اسٹک، نیل پالش کا رنگ، خوشبو، کپڑے، کتاب، دوکان، ریستوران، ان کے دل و دماغ کے تمام بند دروازے کھولتا ہوا ان کے گھر تک پہنچ جاتا۔

گھر والوں سے دوستی گانٹھ لیتا۔

مجھے بیمار، عمر دراز، کام چور، بدزبان اور بے حس بتاتا۔ اس طرح مجھے غلط ثابت کر کے ہمدردی حاصل کر لیتا۔

شادی شدہ زندگی کی تلخیوں پر روشنی ڈالتا اور کلیوں کا دل جیت لیتا۔ کلاس تھری کی امپلائز اس کی مرغوب غذا تھیں۔ دراصل یہ لڑکیاں اس کو آسانی سے دستیاب ہو جاتی تھیں۔ اس طبقے کی سائیکولوجی سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ ان کی دلی خواہشات کا کھلے دل سے سواگت کرتا۔

پانچ ستارہ ہوٹل میں شاندار کینڈل لائٹ ڈنر۔

کسی پہاڑی علاقے کی سیر۔
شاپنگ سینٹر سے خریداری۔
تحفہ و تحائف۔
اس کی چھوٹی موٹی مہربانیاں ان کو نہال کر دیتیں۔
دفتر میں اس کو کلاس تھری کا افسر کہا جانے لگا تھا۔ ان کو پٹانا آسان رہتا ہے۔ موقع بہ موقع ان سے فائدہ بھی اٹھاتا ان کو چھوٹے موٹے فائدے دیتا بھی۔ کلرک، اسٹینو، ٹائپسٹ (جن سے وہ اپنے ذاتی کاغذات مفت ٹائپ کرالیتا) لائبریرین (ڈھیروں کتابیں گھر اٹھالاتا جو اس کی الماری کی رونق بن جاتیں) ہوٹل کی ریسپشنسٹ کے ساتھ جہاں وہ شامیں اطمینان سے گزارتا، شراب، چائے، کافی، سینڈوچ سب فری اور چلتے وقت پسندیدہ ایش ٹرے یا چمچہ یا پھول دان اٹھا لیتا۔ اخباروں کے دفتروں میں چھوٹے موٹے کام کر رہی لڑکیاں، ٹیلیفون آپریٹرس جن کے ذریعے وہ مفت بیرونی کال کرالیتا۔ ریڈیو کی کیجوول اناؤنسر، ٹرانسلیٹر وغیرہ وغیرہ۔
وہ اپنی جیب پر قطعی بار نہ ڈالتا۔ ''بیوی کم بخت پوری تنخواہ ہتھیا لیتی ہے۔'' کہہ کر مظلوم بن جاتا۔
ریستوران میں اس کی جیب سے کبھی دس پانچ کے نوٹ سے زیادہ نہ نکلتا۔
''تمھارے پاس......؟''
نوکری پیشہ لڑکی خود ہی بے چاری پرس خالی کر دیتی۔ یہ ان کے پیسوں سے ان کو ہی شاپنگ کرا دیتا اور خود بھی فیض یاب ہو جاتا۔
چھوٹے موٹے سستے تحفے ضرور دے دیتا۔ سرکاری خرچ پر تفریح کرا دیتا۔ ضرورت پڑنے پر سرکاری کار و چپراسی بھی بھیج دیتا۔
بہ یک وقت اس کی نظر چار پانچ ڈشوں پر ایک ساتھ ہوتی وہ کاک ٹیل کا شوقین تھا۔
میں ان کے شکار کے کھیل میں شریک ہو جاتی تو یہ اور خوش ہو جاتے کسی

معشوقہ کا فون آیا تھا یہ بتا دیتی تو ان کا لہجہ ہی بدل جاتا۔ چہرے کی رنگت نکھر جاتی۔
پھر جب اکتا جاتا تو بغیر کسی وجہ کے کوئی بھی معمولی سا الزام لگا کر بے رحمی سے الگ ہو جاتا۔ سفاک اور بے درد بن جاتا۔ بعض وقت Sadistic نظر آتا۔ چھ مہینے سے زیادہ دوستی وہ کسی لڑکی سے نہیں رکھتا تھا۔ یہ اس کا ایک ریکارڈ تھا۔ اسلام کا مداح تھا۔ قرآن اس کو حفظ تھا۔

حالانکہ لڑکیاں وہ ہر قوم کی استعمال کرتا، ان کا استحصال کرتا۔ خاص طور سے غیر قوم کی مرغوب تھیں، جن کا شین قاف تو نہ درست ہو لیکن ۳۶-۲۴-۳۶ کے ہندسوں میں غلطی نہ ہو۔ کمسن پر نظر رہتی۔ ایک عجب قسم کا جنون تھا اس پر۔ اکثر ترس بھی آتا۔ اتنا تشنہ کہ سمندر بھی پی جائے تو پیاس نہ بجھے۔ عجب قسم کا اضطراب۔

اکثر لڑکیاں بھی اس پر عاشق ہو جاتیں۔ اس کی بے چارگی کا انداز ہی کچھ ایسا تھا۔ نہ جانے کیا کیا گرُ تھے اس میں۔ بھولا بابا بن جاتا۔ بچوں کی طرح آنچل میں منہ چھپا لیتا۔ لیکن حیوانیت طاری ہوتی تو اتنی بری بری گالیوں کا استعمال کرتا کہ یقین ہی نہ آتا کہ انسان ہے یا حیوان۔ مار پیٹ پر اتر آتا...... ایکدم جنگلی بن جاتا۔ بعض وقت میں خود ہی دعا کرتی کہ اللہ اس بدبخت کو سکون دے۔ اللہ اس بے چین روح کو آرام دے۔ وہ مزے کر کے آتا۔ ٹھاٹ سے کھانا نگل کر چادر اوڑھ کر لیٹ جاتا۔

"آج بے حد تھک گیا دفتر میں کام......"

"زیادہ تھا......" میں سب سمجھ چکی تھی۔ اب کچھ کہنا سننا لاحاصل تھا۔ اس کو سدھارنے کی گنجائش باقی نہ تھی۔ یہ میں جان گئی۔ اسی گھٹن میں جینا تھا۔ میں نے اس کی طرف سے دھیان ہٹا لیا اور اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

یہ مطمئن تھے۔ دیر رات ان کے فون آتے یہ بھی کرتے۔ فون پر سرد آہیں اور سسکیاں بھرتے۔ جھوٹ موٹ کھانستے۔ اپنے مرض کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے۔ میں چپکے چپکے سنتی۔ بعد میں مجھے ہنسی آنے لگی۔ دل ہی دل میں خوب ہنسنے لگی۔ اچانک میں مجبور ہو گئی۔ میری غیر موجودگی میں محلّہ کی کئی عورتوں نے کئی لڑکیوں کو

میرے گھر پر ان کے ساتھ آتے جاتے بھی دیکھا۔

ٹور پر یہ اپنی نئی اسٹینو کے ساتھ گئے تھے۔ ان کے پرس کی اندرونی تہہ سے دار جلنگ کا ٹکٹ نکلا جس پر Lower Birth،M-40 اور Upper Birth F-20 لکھا تھا۔

کبھی ان کی میرٹ لسٹ میں رہی پامیلا اب میری نئی دوست بن گئی۔ پامیلا نے ہی بتایا کہ ''مردوں میں نسوانی حسامیت (Female Sensitivity) کا فقدان ہوتا ہے اور وہ اپنے Macho Attitude میں گم رہتے ہیں۔ اس لیے مرد اور عورت کبھی اچھے دوست ثابت نہیں ہو سکتے جتنا عورت، عورت......''

یہ بات میری موٹی عقل میں بھی آ گئی۔

اب میں خوب بیوٹی پارلر جاتی اور طرح طرح سے مالش کراتی۔ کریم میں ڈوبے ہوئے نرم ملائم ہاتھوں کا لمس عجب خواب آور کیفیت پیدا کر دیتا۔

فیشل...... پیڈی کیور...... مینی کیور...... آرام سے کرواتی...... روح تک کی تھکان اُتر جاتی۔ بالوں کے نئے نئے اسٹائل بنواتی۔ اکیلی ریستوران جاتی۔ موسیقی سنتی۔ خوش رہتی۔

یہ مجھ سے تھوڑا ڈرنے لگے...... پتا نہیں کیوں؟

سرد تنہا راتوں میں اٹالین ملائم کمبل کا لمس انسانی لمس سے زیادہ سچّا اور اچھا لگنے لگا۔ (کوئی ڈر نہ خوف) یہ اپنا خراج بھی نہیں مانگ سکتا۔

پامیلا کے مشورے کے مطابق میں نے خوبصورت تراش خراش کے کپڑے پہننا شروع کر دیے پہلے میں ڈھیلے ڈھالے پہنتی تھی۔

میں پھر سے اپنے ڈھرّے پر اتر آئی۔ بچّے کو تو کرچ میں ڈال ہی دیا تھا۔ اب دن بھر ناولیں پڑھتی۔ ٹی وی دیکھتی۔ طرح طرح کی فلمیں دیکھتی۔ لگتا نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ کھاتی پیتی، وزن کافی بڑھ گیا۔ ایک دن محلے کی عورتیں جھنڈ بنا کر پھر نمودار ہوئیں۔

''تم بڑی موٹی ہو رہی ہو؟''

"جی!"

"بس ذرا ڈھنگ کے کپڑے پہنو۔"

"جی!"

"تمھارا میاں خوب کمارہا ہے سنا۔"

"جی!"

"تم کو خوب خوش رکھتا ہے، بڑا آرام وٹھاٹ دے رہا ہے۔"

"جی!"

"بچّے کو کریچ میں نہیں ڈالنا چاہیے، برباد ہو جاتا ہے بچّہ۔"

"جی!"

"تمھارا میاں بڑا ٹور کر رہا ہے۔"

"جی!"

"تمھاری بے راہ روی بڑھ رہی ہے۔ تم دن بھر تالا لٹکا کر غائب رہتی ہو؟"

"جی، چائے بناؤں؟"

"ہاں بھئی ضرور۔" وہ سب پسر گئیں۔

میں ان لوگوں کو جلدی سے جلدی ٹپٹانا چاہتی تھی۔ میرے پاس "فائر" فلم کے دو ٹکٹ تھے۔

□□
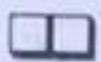
چراغِ خانۂ درویش

نورچشمی صدف سلمہا—— دعائیں!

نہایت افسوس و بصد رنج یہ اطلاع دے رہا ہوں کہ ہندوستان جنت نشان کے پرسکون گاؤں کے بھی بیشتر افراد ذہنی پستی کا شکار ہو گئے ہیں۔ عزیزہ نمستے۔ جب مجھ سے ملاقات کر کے نہال گڑھ ریلوے اسٹیشن پر سوار ہونے جا رہی تھیں، تبھی دہشت گردوں کے ایک گروہ میں گھر گئیں اور رام کھلاون ہرواہا سب بری طرح زخمی ہو گئے۔ عزیزہ نے وہیں پر...... (انا للہ وانا الیہ راجعون)

ان کی آخری رسوم میں شامل ہونے کے لیے صفدر میاں دلّی سے آ گئے تھے۔ یہاں عجیب افراتفری کا عالم ہے۔ ہر طرف ایک انتشار، بے یقینی کی کیفیت، عدم تحفظ کا احساس، اعلیٰ انسانی قدروں اور مذہبی اخلاقیات کی جیتی جاگتی تصویر ہمارا دُور افتادہ گاؤں بھی دہشت کی گرفت میں ہے۔

دعاگو تمھارا ابا

ابا کے ہاتھ کی لرزش تحریر میں صاف نمایاں تھی۔ صدف کے ہاتھ میں خط کانپ رہا تھا۔ شکاگو کی برفیلی ٹھنڈ میں بھی اس کو پسینہ آ گیا۔ ٹیلی ویژن پر آتی ہوئی خوفناک خبروں کو سنتے سنتے اس کا سر چکرا گیا۔ کرسی سے اٹھ کر سوئچ آف کیا۔ کمرے کی خاموشی بولنے لگی۔ پردوں کے پیچھے چھپی پراسرار ہوا نے سرگوشی کی۔ ذہن کے دریچوں سے اس کا بچپن جھانکنے لگا۔

سات محرم، پریم نارائن اور صفدر نہا دھو کر دادی کے پاس کھڑے ہیں۔ دادی

کالا کرتا پہنا رہی ہیں۔ ہاتھوں اور گلے میں سیاہ سبز ڈورے باندھ رہی ہیں۔ تار پہ ٹنگی سبز ٹوپیاں سوکھ گئی ہیں۔ ان کا کچا رنگ تار پر اتر آیا ہے۔ دونوں اپنے اپنے سروں پر جلدی جلدی پہن رہے ہیں۔

"جلدی چلو پریم دیر ہوت ہے مجلس ما۔" جمیلہ پھوپھی کہہ رہی تھیں۔

امام باڑے میں پریم نارائن پُرسوز آواز میں نجم آفندی کا نوحہ پڑھ رہے ہیں:

قوم کا آفتاب پیاسا ہے
ماہ و انجم رکاب پیاسا ہے
ہائے جانِ رباب پیاسا ہے

کربلا میں حسینؑ پیاسے ہیں
سیّدِ مشرقین پیاسے ہیں

مجلس پر رقت طاری ہے۔ دادی کو غش پر غش آ رہا ہے۔ شیخ پور کی سیدانی زبیدہ کی اماں مجلس میں شرکت کرنے آئی ہیں۔ دادی سے پوچھ رہی ہیں۔ "یہ گورے مکھڑے، گھنگھرالے بالوں والا لڑکا جو ابھی ابھی نوحہ پڑھت رہا نجیب الطرفین تو ہے نا؟"

"ہاں خالہ...... ایک دم...... میرا پھوپھی زاد بھائی ہے بھئی۔" صفدر ہنس رہا ہے۔ "زبیدہ کا رشتہ......" وہ پھسپھسائیں۔

"ایک دم دے دیجیے۔ نمستے بوا سے بات کرتا ہوں۔" صفدر نے چٹکی لی۔

"کیا؟ نمستے کون؟" ان کی بھنویں ماتھے تک چڑھ گئیں۔

"بھیا کی منہ بولی بہن۔" جمیلہ پھوپھی دھیرے سے بولیں۔

ڈیوڑھی میں شور مچا۔ "حسن پور سے ادھا آئے گوا۔"

بچوں کا غول ان کی پیشوائی کو حاضر۔

سر سے پیر تک سفید چادر میں منڈھی نمستے بوا چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی صحن میں داخل ہوئیں۔ حسینہ کی اماں نے باورچی خانے سے ہی سلام داغا۔

چنبیلی کی بیل کے پاس بچھی چوکی پر دادی نماز پڑھ رہی تھیں۔ سلام پھیر کر

پلیئیں۔ نمستے بوا نے جھک کر تسلیم کی۔

''جیو۔ خوش رہو...... عمر دراز ہو...... خوش نصیب ہو...... پریم نارائن کا سہرا دیکھو......''

وہ پاس پڑی بید کی کرسی پر بیٹھ جاتیں۔ سر سے ڈھلکی چادر درست کرتیں۔ ہلکی گلابی سوتی ساڑی میں ان کا روپ لشکارے مارتا۔

بچوں کا غول چاروں طرف سے گھیرا بندی کر دیتا۔ وہ مسکراتیں۔ ایک ایک کو گلے لگاتیں۔ ماتھا چومتیں۔ سلامتی کی دعائیں دیتیں۔ پھر پلاسٹک کی جھبیا سے اچار، مربے اور پاپڑ، امرس (آم پاپڑ) نکال نکال کر تپائی پر رکھنے لگتیں۔

''دال موٹھ نہیں لائیں۔'' صبا چلائی۔

''لائی ہوں بٹیا۔'' وہ کاغذ کی بڑی سی پڑیا میں لپٹی اپنے ہاتھوں کی بنائی دال موٹھ صبا کو تھما دیتیں۔ لوٹ کھسوٹ کر سب بھوت نما بچے کھا جاتے۔

''نمستے بھی بھلا کوئی نام ہوا؟'' ایک بار صدف نے ابا سے پوچھ لیا۔ ابا کے ہنستے چہرے پر مسکراہٹ تھم سی گئی۔

''بیٹے...... نام تو کسی کا کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اب تمھارا نام صدف ہے تو کیوں ہے۔ بس گھر والوں نے رکھ دیا اس لیے ہے نا...... ایسے ہی۔'' صدف بات کاٹتے ہوئے پوچھتی ''پر ابا نمستے بوا ہندو ہیں نا؟''

''ہائیں یہ ہندو مسلمان تم کو کس نے بتایا؟ سب انسان خدا کی تخلیق ہیں۔ ایک جیسے ہی۔ ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ نمستے تمھاری پھوپھی ہیں، جیسے جمیلہ پھوپھی ہیں ویسے ہی۔''

''ان کے والے پھوپھا کہاں ہیں؟'' صدف کے سوال ختم ہی نہ ہوتے تھے۔

''برما کی جنگ میں بہادری سے لڑے اور شہید ہوئے۔ ان کی بیوہ نمستے لڑکا پریم نارائن برما چھوڑ کر یہاں پناہ لینے آئے۔ تمھارے دادا نے ان کو کھیت اور زمین دی۔ رہنے کے لیے حسن پور میں گھر بنوا دیا۔ تب سے یہ لوگ یہی ہیں۔ ہمارے خاندان کے فرد کی طرح......''

ماہ و سال گزرتے رہے۔ وقت کا پنچھی آفتاب کے طلوع و غروب کے درمیان پرواز کرتا رہا۔ بچے اسکول سے کالجوں میں پہنچ گئے۔ کئی کی شادیاں ہوگئیں۔ صدف ڈاکٹر بن گئیں۔ صفدر انجینئر ہوگئے۔ پریم نارائن نے بی۔اے، ایل۔ ایل۔ بی کرلیا۔

زمینداری کا خاتمہ۔ ابا بے حد پریشان۔ صبا کی منگنی ہوگئی تھی۔ روپے کا کوئی انتظام نہیں ہوپا رہا تھا۔ شادی کی تاریخ پر تاریخ ٹل رہی تھی۔ لڑکے والے ضد پر آگئے۔ منگنی توڑ دیں گے۔ دادی کی حالت خراب۔ نمستے بوا نے آہستہ سے پوچھ لیا ''بھیا کاہے نہیں تاریخ دے ڈالتے؟''

ابا چپ۔ ایکدم خاموش۔ خاموشی کی آواز سن کر نمستے بوا چپ چاپ اُٹھ کر چلی گئیں۔ دوسرے دن لوٹیں تو ہاتھ میں منگل سوتر۔

''بھیا اسے بیچ دیں۔''

''نہیں نمستے۔ یہ سہاگ کی نشانی ہے۔''

''جب سہاگ ہی اُجڑ گیا تو نشانی کا کیا کرنا ہے۔ بھیا اس کے علاوہ کوئی زیور میرے پاس بچا نہیں ہے۔ انکار نہ کرنا۔'' ابا چپ۔

کافی دِنوں بعد ابا نے کچھ زمین بیچ کر روپیہ لوٹانا چاہا۔ نمستے بوا رو پڑیں۔ ''کا ہم صبا کی بوا نہیں ہیں۔ ہمار کوئی حق نہیں ہے بٹیا پہ؟''

ابا و دادی چپ!

دادی کا انتقال ہوگیا۔ سب شہروں سے دادی کے سوئم میں پہنچے۔ صدف کی نظر دالان کے اندھیرے گوشے میں پڑی۔ سفید ساڑی میں ملبوس ایک بی بی گھٹنوں میں سر دیے سسکیاں لے رہی تھیں۔

پاس جاکر صدف نے ان کو چپ کرانا چاہا۔

سر اٹھایا۔ سفید اُلجھے بال، آنسوؤں سے بھیگا چہرہ، زرد رنگت، یہ میری پیاری دادی کو اتنا چاہنے والا کون؟ تجسّس نے آنکھ کھولی۔

''لالٹین لانا۔'' صدف نے پکارا۔

''رہنے دو بی بی، امّی نہیں رہیں اب اُجالا......''

"نمستے بوا۔" صدف ایکدم لپٹ گئی۔ "اللہ! آپ اتنی کمزور، زرد ہو گئی ہیں۔ میں پہچان ہی نہیں پائی۔ آپ کے سیاہ بال اب مکمل سفید ہو گئے دادی کی طرح......"

ابّا نے بعد میں بتایا کہ نمستے نے دادی کی اتنی خدمت کی جتنی ان کی سگی بیٹیاں اور بہویں تک نہ کر سکیں۔ حالانکہ دادی کرانک قسم کی مذہبی خاتون تھیں لیکن اپنا کام نمستے سے کرانے میں کوئی عار نہیں محسوس کرتی تھیں۔

یہ ہمارے بزرگ بھی کتنے گریٹ تھے۔ صدف نے چپکے سے سوچا۔ ساری دنیا میں رنگ و نسل کی بنیاد پر جنگ چل رہی ہے اور یہاں اس گاؤں کے بوسیدہ خستہ حال حویلی نما گھر میں اتنا سکون، اتنا ایکا......؟

دادی کی موت سے ابّا ٹوٹ گئے۔ امّی کی موت تو وہ سہہ گئے تھے۔ بچّے تھے۔ گھر بھرا تھا۔ اب سب بچّے بڑے ہو کر کالجوں اور نوکریوں میں اُلجھ گئے۔ واپسی کا راستہ بھی بھول گئے۔

گرمی اور جاڑے کی چھٹیوں میں ابّا انتظار کرتے رہتے۔ شاید کوئی لڑکا، لڑکی، بہو آجائے۔ صدف کو یاد آیا۔ ایک مرتبہ میڈیکل کالج کے ہاسٹل سے گرمی کی چھٹی میں گاؤں آرہی تھی۔ اس نے ابّا کو خط لکھا۔ اسٹیشن پر سواری بھیج دیجیے۔ تب گاؤں کی سڑک کچّی تھی۔ رکشہ تانگا نہیں جاتا تھا۔ صدف جب اسٹیشن پر اُتری تو اڈھا کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اڈھے میں بیٹھ گئی۔ 'رام پھیر چلو۔' رام پھیر نے بیل روک کر کہا۔ "بڑے بھیّا یہ رُقعہ دیے ہیں۔" اس نے رقعہ ہاتھ میں لے کر پڑھا۔ ابّا نے لکھا تھا "بڑی بہو آرہی ہیں دلّی سے۔ تم رُک کر اُن کی ٹرین دیکھ کر آنا۔"

وہ سارا دن ہر ٹرین دیکھتی رہی۔ اندھیرا گھر آیا۔ آخری ٹرین جاچکی تو گھر کا رُخ کیا۔

گھر پہنچ کر پتہ چلا بڑی بہو کے آنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ ابّا نے ان کو بار بار آنے کو لکھا تو انھوں نے جواب میں یوں ہی لکھ دیا شاید میں ان تاریخوں میں آؤں۔ اور اس شاید کی بنا پر ابّا نے مجھے سارا دن سڑے اسٹیشن پر انتظار کروا دیا۔ صدف کا غصے

سے برا حال۔ پھر یکلخت اسے ابا کی شدید تنہائی، بے بسی، محبت اور انتظار پر رونا آگیا۔
واقعی بڑھاپا کتنی اذیت ناک شے ہے۔ بچے تک ساتھ چھوڑ دیتے ہیں ماں باپ کا۔ لیکن ابا نے تو دادی کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑا۔ پوری زندگی دادی کے قریب رہ کر گزار دی۔ فرمابردار پسر۔

پھوپھیاں اپنی سسرال میں مگن۔ چچا، بڑے ابا، اپنے اپنے خاندان میں مصروف۔ دادی کے بعد ابا کے پاس صرف تنہائی تھی۔ اذیت کی آخری حد تک تکلیف دہ تنہائی۔ ہاں نمستے بوا جو اَب بھی پہلے کی طرح آتی تھیں۔ اب وہ دادی کے بجائے ابا سے گھنٹوں باتیں کرتیں۔ ان کا دل بہلاتیں۔ آم رس اور پاپڑ لاتیں۔ حالانکہ ابا کھاتے نہیں تھے۔ اس بات کا علم نمستے بوا کو بھی تھا لیکن وہ لاتیں ضرور۔ ابا الماری میں رکھ دیتے۔ پریم نارائن محرم کے کاموں میں مدد کرواتا۔ کھیتی کا کام سنبھالتا۔ راکھی پر ابا نمستے بوا سے ٹیکا کراتے۔ پھر وضو کر کے نماز پڑھنے چلے جاتے۔ وہ ابا کی عمر درازی کی دُعا مانگتی رہتیں۔

اس خط کے چند مہینے بعد ہی صفدر نے ابا کے ہارٹ اٹیک کی خبر صدف کو سنادی۔

کئی سال گزر گئے۔ گاؤں کی یاد صدف کو گھر تک کھینچ لائی۔ شکستہ درودیوار ماضی کی کہانی کہہ رہے تھے۔ صدف نے صفائی کی غرض سے ابا کی الماری کھولی تو بھربھرا کر کئی ڈبے گرے جن میں آم رَس اور پاپڑ کے سوکھے ٹکڑے رکھے تھے۔

یا خدا! ابا اور نمستے بوا کا کیا روحانی رشتہ تھا۔ یہ دونوں کس قسم کے مذہبی لوگ تھے۔ دونوں بھائی بہن اُفق کے اس پار مزے سے باتیں کر رہے ہوں گے۔ زمین کی قتل وغارت گری سے بے نیاز، قیدِ حیات سے آزاد ہو جانے کے لیے خدا کا شکر ادا کر رہے ہوں گے۔

□

زندہ آنکھیں مردہ آنکھیں

صبح صبح بڑے بھیّا سائیکل پر چڑھ کر مقدمے کے سلسلے میں نکل جاتے۔ پہلے وہ صبح سو کر اٹھتے تھے تو ان کا چہرہ ہلکے ہلکے مسکراتا رہتا تھا۔ ان کی خوبصورت آنکھیں روشن رہتی تھیں لیکن اب...... دُور دُھند لکوں میں گم رہتیں۔ فرح گرم گرم چائے پکڑا دیتی۔ ''جلدی لوٹ آیئے گا...... اندھیرا ہونے سے پہلے...... دشمنوں کا کچھ ٹھکانہ نہیں، تنہا دیکھ کر کچھ بھی کر سکتے ہیں......''

''ہوں......'' اور نگاہیں کہیں کھو جاتیں۔

بڑے بھیّا گرم چائے حلق میں اُنڈیل کر خالی پیالہ اس کے ہاتھ میں تھما دیتے اور سائیکل پر سوار ہو کر آگے بڑھ جاتے۔ فرح یادوں کے غبار میں کھو جاتی۔ چھ سال صرف چھ سال میں بڑے بھیّا کا چہرہ کتنا بدل گیا ہے۔ صرف چہرہ ہی کیا وہ خود بھی بہت تبدیل ہو چکے ہیں۔ اتنے ذمّہ دار...... سمجھدار اور حساس...... یہ روپ بڑے بھیّا کا...... یقین نہیں آتا۔

شام کو تھکے ہارے لوٹتے تو چہرہ ساکت اور آنکھیں مردہ ہو جاتیں۔ صبح زندہ آنکھیں، شام مُردہ آنکھیں۔

''بڑے بھیّا......''

''چُپ...... لمبی چُپ......''

صبح سے شام تک کے سفر میں بڑے بھیّا کی آنکھیں مر جاتی ہیں۔ پھر اگلی صبح زندگی کے کچھ کچھ آثار نظر آتے ہیں۔ نہیں...... بڑے بھیّا نہیں...... وہ مضطرب ہو

جاتی۔ تمھارا یہ دُکھ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ تمھارا یاس میں ڈوبا چہرہ میں نہیں دیکھ سکتی۔

تمھارا وہ غرور، وہ طبقاتی برتری کا احساس...... وہ زمیندارانہ اندازِ حکمرانی اور چنگیزی جلال سب کہاں چلا گیا؟

اب تو جب شام کا اندھیرا چھانے لگتا ہے، بھابھی لالٹین جلا کر ڈیوڑھی میں رکھ دیتی ہیں۔ تب سائیکل کی گھنٹی بجتی ہے۔

فرح کو لگتا ہے ابا آگئے۔ پھر فوراً ہی خیال آتا ہے، ان کو گزرے تو عرصہ بیت گیا۔ وہ دوڑ کر ڈیوڑھی کا دروازہ کھول دیتی ہے۔

"تم پڑھتی لکھتی نہیں ہو...... ہر بار تم ہی دروازہ کیوں کھولتی ہو؟" مردہ آنکھیں سوال کرتیں۔

"میں نے پڑھائی چھوڑ دی ہے...... اور بھابھی برتن دھو رہی ہیں۔"

"ہوں......" مُردہ آنکھیں چپ ہو جاتیں۔

اس چہرے کے پیچھے ایک اور چہرہ اُبھر آتا اور آگے والا چہرہ پیچھے والے چہرے میں ڈوب جاتا۔ اب پیچھے والا چہرہ آگے آجاتا اور آگے والا چہرہ ماضی میں تحلیل ہو جاتا۔

جھریوں سے اَٹا چہرہ...... تمام عمر کا بوجھ ڈھوتا ہوا تھکا چہرہ......

"بڑے بھیّا" فرح کا دل چاہتا چیخ اُٹھے۔ "تم ابا تو نہیں ہو؟"

لیکن تب تک پہلے چہرے سے جھرّیاں ہٹ جاتیں۔ صرف مُردہ آنکھیں برقرار رہتیں...... جن سے کوئی سوال نہیں پوچھا جاتا......

کوئی جواب نہیں ملتا، کیونکہ مُردے جواب نہیں دیتے۔ تم لاکھ چیخ چیخ کر پوچھتے رہو......

بڑے بھیّا پرانی سائیکل سے میلوں کی مسافت طے کرتے...... تپتی دھوپ...... لُو...... کڑکڑاتی سردی...... دُھواں دھار بارش میں کچہری کے چکر لگاتے رہتے......

لیکن کوئی فائدہ نہیں...... مخالف پارٹی فائلیں ہی غائب کرا دیتی...... جھوٹی گواہی دلا

دیتی۔ کڑکڑاتے نوٹوں کی گرمی میں انصاف پگھل جاتا۔ بڑے بھیّا کے تھکے قدم سائیکل کے پیڈل پر کمزور پڑ جاتے۔ رفتار دھیمی پڑ جاتی...... چر٘ر...... مر٘ر کرتی چین راستے میں ہی اُتر جاتی...... بار...... بار...... چڑھاتے۔ پھر چڑھاتے...... پھر اُتر جاتی۔ سائیکل کی چین نہ ہوئی، زندگی کی جدو جہد ہو گئی۔

ڈیوڑھی سے لگی کھڑی چھوٹے بھیّا کی کار بے رُخی کے عالم میں اتراتی...... "گاڑی ٹھیک سے ڈھانک دو...... دھول بیٹھ جائے گی۔" بڑے بھیّا چھوٹے کی گاڑی کی بڑی فکر رکھتے تھے۔

فرح چلاّ پڑتی۔ "آپ اتنی لو دھوپ میں سائیکل پر جائیں لیکن اس پر گرد نہ جمے۔ کیوں اتنی فکر ہے آپ کو؟ کیا کیا ہے چھوٹے بھیّا نے آپ کے ساتھ؟" وہ زرد سی ہنسی بکھیرتے...... لیکن مردہ آنکھیں ہنسی قبول نہیں کرتیں۔

چھوٹے بھیّا اپنی کار چھوڑ کر آسٹریلیا جا چکے تھے۔ وہاں بزنس میں کافی پیسہ تھا۔ ان کے بیوی بچے دلّی میں رہتے تھے۔ سب کے پاس الگ الگ گاڑیاں تھیں۔ پرانے ماڈل کی کار تھی اس لیے چھوٹے بھیّا گھر پر ڈال گئے۔ پڑی رہے گی۔ کبھی آکر استعمال کریں گے۔ اس کی دیکھ ریکھ کا ذمہ بڑے بھیّا کا تھا۔ بڑے بھیّا میں پوری خودداری ابا کی اتر آئی تھی۔ فرح کو حیرت ہوتی تھی۔ اس نے بچپن سے اس شخص کو کیوں نہیں پہچانا تھا؟

فرح ان سے ملی ہی کب؟ اور جب ملی تو ان کی شخصیت کیسی تھی؟ بڑے بھیّا گھر چھوڑ کے کیوں چلے گئے تھے یہ فرح کو اب سمجھ میں آتا ہے۔ پہلے نہیں آتا تھا۔ اتنا خوددار انسان رہ بھی کیسے سکتا ہے گدھ نما رشتہ داروں کے ساتھ۔ جہاں سب چھوٹے بھیّا کی دلجوئی کرتے رہتے۔ ابا اماں کی محبت کا مرکز چھوٹے بھیّا ہی تھے۔ خوش گفتار، خوش اخلاق، معصوم چہرے والے چھوٹے بھیّا۔

بڑے بھیّا شروع سے ہی اکھڑ اور غصہ ور مشہور تھے۔

ابا اماں نے تو سب برداشت کرنا سیکھ لیا تھا۔ سارا خاندان جونک کی طرح ابا کا خون دھیرے دھیرے چوستا رہتا۔ بڑے بھیّا کو ابا اور چھوٹے بھیّا کے خلاف بھڑکاتا

رہتا۔ دستر خوان پر سب ساتھ کھانا کھاتے مگر میل محبت کی زبان کوئی نہیں بولتا۔ ماموں اور چچا گھر کی جڑیں کھودنے میں لگے رہتے۔ کبھی سینندھ لگوادی جاتی تو کبھی ڈاکا پڑ جاتا۔ کھلیان سے پورا اناج اُٹھ جاتا۔ ابّا مروّت میں بول ہی نہیں پاتے تھے۔

فرح چھوٹی تھی تبھی بڑے بھیّا گھر سے بھاگ گئے۔ سنا کافی عرصہ بیکار گھومے۔ نوکری ملی نہیں۔ پھر کہیں دُور دراز کے علاقے میں معمولی کلرکی مل گئی۔ وہاں چپ چاپ شادی بھی کرلی۔ کسی کو خبر نہیں دی۔ دس سال بعد ایک دن اچانک ایک پیاری سی بچّی کو لے کر گھر آگئے۔ ابّا ضعیف ہو چکے تھے۔ ان کو دیکھ کر ان کے چہرے کی جھرّیاں تک جیسے مسکرانے لگیں۔ کمزور آنکھوں میں چمک سی آگئی۔ سکون کی ٹھنڈی سانس لی۔ چپ چاپ گلے لگالیا۔

"پاپا کے پاس چلو۔" بچّی نے منہ بنایا۔

فرح دروازے سے دوڑ کر امّاں کے پاس آگئی۔

"امّاں...... بڑے بھیّا کی لڑکی آئی ہے۔" امّاں لڑکھڑا کر اٹھیں۔ دالان میں بڑے بھیّا کھڑے تھے۔ ابّا سا لمبا قد وہی سنجیدہ تیور......

"السلام علیکم امّاں!" انھوں نے امّاں کے قریب آکر کہا۔

خوشی کی شدّت سے امّاں رونے لگیں۔ "ارے منّا! بوڑھی امّاں کا بھی خیال نہ آیا۔ تیرے غم میں روتے روتے اندھی ہوگئی ہوں بیٹا...... شادی بھی رچالی...... خبر بھی نہیں کی...... کیا کیا ارمان تھے میرے۔ بڑی دُلہن کو اپنا جوڑا پہناتی...... اپنا زیور وارتی اس پر...... چھوٹا بھی ہمیں چھوڑ کر آسٹریلیا چلا گیا...... کتنا روکا...... منایا...... پر پیسے کا لالچ...... بوڑھے ماں باپ...... چھوٹی بہن کسی کا خیال نہیں کیا...... باس کی لڑکی سے شادی کی، ہمیں کارڈ بھیج دیا...... بیوی کو دلّی میں رکھا ہے...... اس کے لڑکے وہیں پڑھتے ہیں۔ لیکن کبھی یہاں نہیں آتے...... پر جب اپنے ہی بیٹے اپنے نہیں ہوئے تو اس کی بیوی و لڑکوں کو کیا کہوں۔"

"اب بس۔" ابّا نے امّاں کے کمزور شانے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ سب کی آنکھیں جھلمل۔ بڑے بھیّا کی سوکھی سی بیگانی ہنسی۔

یہ تھی پہلی ملاقات...... بڑے بھیّا سے فرح کی۔ پھر ایک بار بیوی کو لے کر آئے اماں کے چالیسویں میں۔ اماں کی آنکھیں بڑی بہو کا انتظار کرتے کرتے بجھ گئیں۔

کچھ دن رہے۔ ایک دن اس سے سوال کر بیٹھے۔

''تم کیا پڑھ رہی ہو؟''

''وکالت۔''

''بی اے کرنے کے بعد!''

''جی نہیں...... ایم اے، پی ایچ ڈی کر چکی ہوں۔''

''اتنا پڑھنے سے کیا فائدہ؟'' ان کے ہونٹوں پر تمسخر آمیز مسکراہٹ تھی۔

''آپ سے مطلب؟'' فرح جھلا گئی تھی۔ وہ اونچی آواز تک سننے کی عادی نہیں تھی۔ ابا کی سر چڑھی۔ اکیلی بٹیا۔ اماں کی آنکھوں کا تارا۔ بیحد لاڈ پیار میں پلی بڑھی۔ چھوٹے بھیّا کی دُلاری۔ خاندان کی سب سے قابل۔ سب سے زیادہ پڑھی لکھی لڑکی۔ صورت میں ضرور مات کھا گئی تھی تو کیا...... ابا کا پورا چہرہ پایا تھا۔ اماں بے حد حسین تھیں۔ چھوٹے بھیّا، بڑے بھیّا اماں پر پڑے تھے۔ ابا منگولین چوکور آنکھوں والے، گہرے سانولے رنگ کے لمبے دُبلے پتلے سے تھے۔ فرح کے چہرے پر ابا کا چہرہ لگا تھا۔ ناخون، انگلیاں، پوریں، ابا کی چھاپ رنگ رُوپ، خودداری، حسّاس طبیعت، کم گوئی سب ابا کا فرح کے پاس۔

سارا خاندان دانت لگائے رہتا۔ دو دو لڑکے کماتے ہیں۔ چھوٹا باہر کے ملک میں ہے۔ ابا لاکھوں دبائے بیٹھے ہوں گے۔ اماں زیور گڑھاتی ہوں گی۔

کوئی یہ نہ سوچتا کہ اتنی سی زمین میں کیا ہوتا ہے۔ اوپر سے ہزاروں مقدمے بازیاں...... دونوں لڑکے ٹکا بھی نہ بھیجتے۔ ابا یہ بات کسی سے بھی نہ کہتے۔ اماں تو منہ سل کر بیٹھ گئی تھیں۔

ابا بھری دُھوپ کی دوپہر میں اور کاتِک کی رات میں کھیت پر چلے جاتے۔ ''پانی لگا کہ نہیں''۔ ''کھیت کٹ رہا ہے''۔ ''بٹائی ہونے جا رہی ہے''۔ ''ارہر کٹ رہی ہے''۔

''آج آم توڑا جارہا ہے''۔ ''نہر پھوٹ گئی ہے''۔ ''کھیت میں پانی نہیں جارہا ہے۔'' ابا بے چین ہو کر ٹہلتے۔

کھیت، لگان، کچہری، مقدمہ، زمین کے ہزار جھنجھٹ......

''ابا...... زمین بیچ کر شہر میں رہیے اطمینان سے۔'' فرح ابا سے ضد کرتی۔

''نہیں بٹیا...... اپنے بزرگوں کی زمین کو، کھیت کھلیان کو نہیں چھوڑا جاتا۔ زمین رُوٹھ جاتی ہے۔'' ابا زمین کو محبت اور عقیدت سے دیکھتے۔

گھر میں لگے آم کے درختوں کو روز صبح و شام سینچتے۔ خود ہزارہ لے کر لگے رہتے۔ پتہ پتہ نکھر آتا اتنا دھوتے۔

ابا کو درختوں سے بے حد پیار تھا۔ آم میں بور آتے اور ابا کا چہرہ کھل جاتا۔ لاسا لگ جاتا تو ابا کا چہرہ اُتر جاتا۔ علی الصبح نماز کے وقت اُٹھ جاتے۔ مسجد سے لوٹتے تو مٹھی میں ہار سنگھار کے پھول لے کر۔ فرح پڑی سوتی رہتی۔ ابا اس پر شبنم سے بھیگے پھول برسادیتے۔ ''اوں ابا......'' وہ پھولوں کی خوشبو کو اندر تک کھینچ لیتی۔

کھیت، کھلیان، باغ، ذمہ داریاں سنبھالتے سنبھالتے ابا تھکنے لگے۔ اکثر کہتے ''میرے تو دونوں بازو ہی کٹے ہوئے ہیں۔'' آخری وقت میں دونوں بازو تھے۔

''بڑے بھیّا گھر سنبھال لو۔ کلرکی میں کچھ نہیں ہے۔''

''چھوٹے بھیّا...... لگی لگائی نوکری ہے...... یہاں زمین بھی تو کم ہے۔''

ارے تم نئے طریقے سے کھیتی کرنا۔ ہل بیل چھوڑ کر ٹریکٹر لے لینا۔ اپنا ٹیوب ویل لگالینا...... تم کھیتی سے اتنا تو اگا ہی لو گے کہ اپنے خاندان کا پیٹ بھر سکو۔'' سارا خاندان جو ابا کی جان کو لگا رہتا تھا بڑے بھیّا کے پیچھے لگ گیا۔ ''تم گھر بار سنبھالو...... بزرگوں کی زمین کو مت چھوڑو...... میں روپیہ بھیجتا رہوں گا...... جب ضرورت ہو زیادہ کی لکھ دینا بس۔'' چھوٹے بھیّا کا بھولا بھالا منہ دیکھ کر بڑے بھیّا جال میں پھنس گئے۔ نوکری چھوڑ کر بیوی بچے سمیت دیہات آگئے۔

چھوٹے بھیّا تو گھر کا پتہ ہی بھول گئے۔ کتنے خط لکھے گئے۔ کوئی جواب نہیں۔ یہاں مقدموں کا جال در جال اور ہزار قرضے......

بڑے بھیا جلد ہی مُردہ آنکھوں والے ہو گئے۔ اس سے بڑے بھیا کی لاچاری دیکھی نہیں جاتی تھی۔ بھابھی کی بوسیدہ ساڑی، بچّوں کے گھسے بدرنگ فراک، بڑے بھیا کی اکلوتی قمیض......

ہر نذر و نیاز پر ہزاروں کا خرچ۔ لبالماں کی مجلس پر خاندان کے تقاضے......

"اس سال برسی پر زیادہ بکرے ذبح کروانا...... پچھلے سال جیسی کنجوسی مت کرنا...... ارے تمھارے والد تھے۔ ان کی روح کو ثواب ملے گا۔"

اس کا دل خون کے آنسو روتا۔ روح کو کیا ان چیزوں سے تسکین ملتی ہے؟ یہ لوگ فاتحہ کا کھانا اتنے شوق سے اور فرمائش کر کے کیسے کھا لیتے ہیں؟ لعنت ہے ان پر۔

"بھیا میں کورٹ جوائن کرلوں؟" ایک دن فرح نے اپنی قانون کی کتابوں سے گرد جھاڑتے ہوئے بڑے بھیا سے پوچھا تھا۔

"ہوں۔" زندہ آنکھیں اوپر اٹھتے اٹھتے مردہ ہو گئی تھیں۔

وہ کانپ گئی تھی...... اُف...... اتنی بے بسی......

"فرح میں کھلا پلا نہیں پا رہا ہوں اس لیے؟" ان کی آواز کی نرمی نے اس کو اندر تک توڑ دیا تھا۔

"نہیں بھیا...... یہ بات نہیں......" وہ تڑپ گئی تھی۔

"خاندان بھر کیا کہے گا؟ ایک بہن ہے اس کے ہاتھ پیلے تو کر نہیں سکا، اس کی کمائی اُڑانے لگا......"

وہ بھڑک اٹھی تھی۔ "خاندان...... خاندان کیا ہمارا پیٹ بھرنے آتا ہے؟ وہ ہمارے دُکھ درد میں شریک ہوتا ہے؟ صرف مذاق اُڑانے...... زخم لگانے...... طنز کرنے میں ماہر ہے...... کوئی مصیبت ہو تو دُور کھڑا ہو کر تماشا دیکھتا ہے۔ اسے ہر بات میں محض اپنے فائدے سے غرض ہے۔ کوئی جیے یا مرے......"

"بٹو صبر کرو...... ہر لمحہ انسانی زندگی کے لیے تغیر و انقلاب لاتا ہے۔" آنکھیں مردہ ہو گئیں۔

پھر ایک دن انقلاب آ گیا۔ بڑے بھیّا کا زندہ جسم مردہ جسم میں تبدیل ہو کر آنگن میں بچھ گیا۔ رقیبوں نے مقدمے کا فیصلہ سنتے ہی راستے میں بڑے بھیّا کو اپنا شکار بنالیا۔ تمام جسم گولیوں سے چھلنی کر کے جھاڑی میں پھینک دیا۔ صفِ ماتم بچھ گئی۔ پورا خاندان مگرمچھ کے آنسو بہانے آ ٹپکا۔ رقیبوں کو بھی شرم نہ آئی وہ بھی چہرے دھو کر آ گئے۔

فرح کو لگا مردہ جسم پر زندہ آنکھیں جاگ اُٹھی ہیں۔ فرح نے زندہ آنکھوں میں جھانک کر پیغام پڑھا اور روتی ہوئی سوگوار بھابھی کو گلے لگالیا۔ دونوں بچّے سہم کر پھوپھی سے لپٹ گئے۔ اس نے ان کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ پھر بھیڑ کی طرف منہ کر کے سرخ آنکھوں سے مخاطب ہوئی۔ ''اب میں مقدمہ لڑوں گی۔ دنیا کی اِس عدالت سے اُس عدالت تک۔'' اس کے چہرے پر گہرے عزم کی چھاپ اور آواز میں چھپی تاثیر دیکھ کر خاندان کے سارے زندہ لوگوں کی آنکھیں مُردہ ہو گئیں۔

اس نے جھک کر بڑے بھیّا کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ان کے مُردہ جسم کی زندہ آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

□□

آڈ نمبر

اچانک خبر ملی کہ مسٹر کپور نہیں رہے۔ خیر یہ کوئی بڑا حادثہ نہیں ہے روز ہی ہزاروں لوگ مرتے ہیں اور پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر میں آواگون پر یقین کرنے لگوں تو کہوں گا کہ مردہ جسموں کی روحیں ہی دوسرے جنم میں پھر اسی دنیا میں آجاتی ہیں۔ یونی بدل کر۔ اور نھو کی اماں کہانی سناتے سناتے ٹیپ کا بند ہمیشہ یہی کہتی تھیں کہ مانس کی یونی میں پرویش بڑی کٹھنائی سے ملتا ہے۔ چوراسی لاکھ یونیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ یعنی یونی نہ ہوئی آئی۔ اے۔ ایس۔ پی۔ سی ایس کا مقابلہ ہوگئی کہ تین بار میں آدمی چنا جائے اور ہر بار جانچا پرکھا جائے پھر بھی چلتا پرزہ نہ ہو اتو پھسڈی رہ جائے۔

مسٹر کپور میرے پڑوسی تھے۔ فلیٹ نمبر ۱۳ میرا ہے اور فلیٹ نمبر ۱۴ ان کا۔ وہ اچھے بھلے تھے لیکن اس رات ایسا سوئے کہ پھر صبح نہیں ہوئی۔ وہ نہیں اٹھے لیکن سوتے ہوئے تمام لوگ جاگ اٹھے۔ مسز کپور کی دل خراش چیخوں نے پوری بلڈنگ کو دہلا دیا۔ حالانکہ مسز کپور ان عورتوں میں سے ہیں جو زبان کا استعمال کرنا ہی نہیں جانتی ہیں۔ بس خاموشی سے مسلسل کام میں لگی رہتی ہیں۔ ممتا بھری ایک مسکان ان کے چہرے پر ہمیشہ کھلی رہتی۔

میں چونکہ اکیلا رہتا ہوں اس لیے اکثر شام کو چائے مسز کپور ہی بھیج دیتیں۔ دیر رات کو ٹور سے لوٹتا تو کھانا بھی بھیج دیتیں۔ شروع میں میں نے سختی سے انکار کیا لیکن ان کی پیار بھری جھڑکی اچھی لگنے لگی۔ تو میں کبھی کبھار ان کے ہاتھوں کا پکا کھانا کھانے لگا۔

کبھی کبھی ان کے بچّوں کو پڑھا بھی دیتا۔ دونوں بچّوں سے میری خاصی گاڑھی دوستی ہو گئی۔ ہاں میں بچّوں کو بالکل پسند نہیں کرتا ہوں۔ لیکن کمال کی بات ہے کہ مسٹر کپور کے بچّوں کے ساتھ اکثر کیرم کھیلتے ہوئے بھی پکڑا گیا ہوں۔ مسٹر کپور سے بھی گپ شپ ہو جاتی۔ بعض اوقات مسز کپور میں مجھے رما دیدی نظر آنے لگتیں۔ شاید عورتوں میں کافی چیزیں کامن ہوتی ہیں، خاص کر ممتا کا انداز۔ میں جذباتی نہیں ہوں۔ ہونا بھی نہیں چاہتا۔ یہ جذبات وزبات، پیار محبت سب لفاظی ہے۔ گورکھ دھندا، بے وقوف بنانے کے طریقے۔ میں سیدھا بلکہ اُلٹے ٹائپ کا آدمی ہوں۔ کھرا کھرا بولنے والا، سخت زبان، بدمزاج۔ لوگ مجھ سے بات کرتے گھبراتے ہیں۔ شاید میری کوئی چول ڈھیلی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ میرے بابا جو اسی شہر میں رہتے ہیں مجھ سے بات برسوں میں کبھی کبھار ہی کرتے ہیں۔ اماں کے انتقال کے بعد نانی کے یہاں پلا بڑھا پھر نوکری میں آ گیا۔ بابا سے کبھی کبھار واسطہ پڑا تو نہ وہ مجھ کو برداشت کر پائے اور نہ میں ان کو۔ میرا ان کا دل کبھی ملا ہی نہیں۔ شاید کبھی ہم دونوں کا نظریہ ایک ہو بھی نہیں سکتا۔ ان کی دنیا الگ ہے میری الگ۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے مس فٹ (Missfit) ہیں، بلکہ چھتیس کا ہندسہ کہوں تو شاید زیادہ بہتر ہو۔ خیر مجھے کیا وہ اپنی دنیا میں مشغول ہیں میں اپنی دنیا میں تنہا۔ اکیلا، مست، اپنی من کی دھونی رمائے پڑا رہتا ہوں۔ یہ مسز کپور کی فیملی میری پڑوسی کیا بنی لگا میں بھی عام انسان نہ بن جاؤں جو کہ میں بننا نہیں چاہتا۔ مجھے بندھے بندھائے گھسے پٹے راستوں پر چلنا سخت ناپسند ہے۔ میں آزاد ہوں، ہر بندھن سے مکت۔ تمام دیواروں کو توڑ کر جینا چاہتا ہوں۔ جی رہا ہوں، کسی سے کوئی جذباتی لگاؤ نہیں رکھنا چاہتا۔

ہاں تو جناب میں بتا رہا تھا کہ مسٹر کپور سوئے تو پھر جاگے ہی نہیں۔ مسز کپور کی دل خراش چیخیں بھی ان کو نہ اٹھا سکیں۔ اس نیک اور شریف انسان کے لیے میرا دل بھی دُکھنے لگا۔ جبکہ اس سے پہلے میرا دل کبھی دُکھا ہو یہ مجھے یاد نہیں۔ جب میں پڑوسی ہونے کے ناطے ان کے فلیٹ میں داخل ہوا تو ساری بلڈنگ کا جماوڑا لگ چکا تھا۔ مسز کپور بے ہوش پڑی تھیں۔ ان کے بچے ڈرے سہمے ایک کونے میں چھپے

کھڑے تھے۔ تمام ہنگاموں سے بے خبر مسٹر کپور سفید چادر اوڑھے مزے کی نیند سو رہے تھے۔

مجھے لگا آج پھر رما دیدی بیوہ ہوگئیں۔ رما دیدی میری اکلوتی بہن بھی اسی عمر میں بیوہ ہوئی تھیں۔ جب میں ان کے گھر گیا تھا تو ایسا ہی سماں تھا۔ جیجا جی کی لاش سفید چادر سے ڈھکی رکھی تھی۔ ہم نے اسے شمشان گھاٹ تک پہنچا دیا تھا۔ عورتوں نے رما دیدی کے ہاتھ ننگے کردیے تھے اور ان کو سفید ساڑی پہنادی تھی۔ مجھے بہت بُرا لگا تھا۔ کچھ بولنا بھی چاہا تھا لیکن کچھ کہہ نہیں پایا تھا۔

مجھے حق ہی کیا تھا بولنے کا؟ میں رویا بھی نہیں۔ میرا کلیجہ تو پتھر کا بنا تھا۔ میں تو جب اماں کی لاش اسپتال سے گھر لایا تھا، اور اس وقت میں صرف دس سال کا بچہ تھا، تب بھی نہیں رویا تھا، یا رو نہیں پایا تھا۔

شاید تبھی سے سارے آنسو برف کی طرح جم گئے تھے جو کبھی نہیں پگھلتے۔ ڈر ہے کبھی پگھل گئے تو قیامت نہ آجائے۔ میں نے فوج کی ٹریننگ کی ہے۔ سخت جان ہوں۔ ہزاروں حادثے دیکھ چکا ہوں۔ اپنوں کی لاشیں اٹھا چکا ہوں۔ آنسو بہانے کو میں انسانی کمزوری مانتا ہوں۔ یوں بھی روتی تو عورتیں ہیں۔ موٹے موٹے آنسو بہا کر مَردوں کو اُلو بناتی ہیں۔ جذباتی طور پر بلیک میل کرتی ہیں۔ ہوں......

لیکن حیرت ہے، مجھے بے حد حیرت ہو رہی ہے۔ آج میں کیوں کانپ رہا ہوں۔ میرے پیر ڈگمگا رہے ہیں۔ میں مضبوط و صحت مند نوجوان ہوں۔ نڈر ہوں، جانباز ہوں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں، سب کچھ سہہ جاتا ہوں۔

بھیڑ بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ رونے چلاّنے کی آوازیں، بین، سب میرے اوپر سے گزر رہے ہیں۔ میں سن رہا ہوں، نہیں بھی سن رہا ہوں۔ گرو کہتے ہیں شریر نشور ہے، آتما اَمر ہے، ڈرنا کیسا؟

مجھے ہلکا سا چکر آگیا۔ شاید کمرے کی گھٹن بڑھ گئی ہے۔ مسٹر کپور کو آخری سفر پر پہنچانے کی تیاری چل رہی ہے...... میں آگے بڑھتا ہوں۔ ان کے جنازے کو کندھا دے کر چار آدمی آگے بڑھتے ہیں، میں بھی مدد کرتا ہوں۔ تبھی مجھے لگا میرا

کرتا کوئی کھینچ رہا ہے۔

میں نے چھڑانے کے لیے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مسٹر کپور کا چھوٹا بیٹا پپو جو مشکل سے تین سال کا ہو گا کُرتا پکڑے تھا۔ اس نے بھیگی پلکیں اٹھا کر چمکتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ "میلے پاپا کو کہاں لے جالیے ہو انکل؟"

میں اندر تک دہل گیا۔ کیا جواب دوں اس معصوم کو؟ میں نے اس کو اٹھانے کی کوشش کی تو وہ میری ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

وہ لرزتے ہوئے نئی کونپل کی طرح لگ رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے دُھند چھا گئی۔ گرم گرم کچھ اندر جانے لگا۔ جھک کر میں نے پپّو کو دھیرے سے گود میں لے لیا۔ وہ میرے سینے سے چپک گیا۔ اپنی ننھّی مُنّی بانہوں کو اس نے میری گردن میں ڈال دیا اور گرم نرم بھیگے ہوئے رُخسار میرے کھردرے چہرے سے سٹا دیے۔

اس کے لمس سے میرا پتھر کا بت پگھلنے لگا۔

کتنی عجیب بات ہے، میرے منہ سے کبھی آہ نہیں نکلی۔ آنکھ سے آنسو کی ایک بوند نہیں ٹپکی۔ اچانک میرے جیسے سخت دل آدمی کے رُخسار گرم گرم آنسوؤں سے جلنے لگے اور میں پھوٹ کر بے اختیار رونے لگا۔

□□
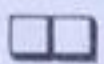
ایک ٹکڑا دھوپ کا

'خالد میاں بہ تاریخ پانچ شوّال بروز جمعہ شتابدی سے بمبئی پہنچ رہے ہیں۔
اسٹیشن پر ضرور آجانا وہ گھبرا نہ جائیں۔

تمہارا چچّا'

چچّا کا تار صبح صبح پہنچ گیا۔ اصغر دفتر جانے کی جلدی میں تھے۔ تار میں نے ہی پڑھ کر سنادیا۔ اصغر کافی بھلکڑ بھی ہیں اس لیے دفتر جاتے وقت ہر چیز مجھ کو چیک کرنا پڑتی ہے۔ جوتے پالش ہیں یا نہیں؟ رومال لیا یا چھوڑ دیا؟ ٹفن رکھا یا بھول گئے؟ بریف کیس میں دفتر کے پیپر رکھے ہیں یا نہیں؟ قلم راحیل تو نہیں اٹھالے گیا۔ راحیل میرا بیٹا...... ہے تو پانچ سال کا مگر ماشاءاللہ عقل خدا نے پچاس سال کے بوڑھے کی عطا کی ہے۔ ہر بات معلوم ہے۔ تجسّس اتنا کہ ہر بات پر سوال۔ ہم لوگ جھلاّ پڑتے ہیں پھر ہنسی بھی آجاتی ہے۔ بچّہ ہے نا، ابھی سے ان کا کمپیوٹر چلا لیتا ہے۔ فلاپی سے لے کر ہر بات کی جانکاری ہے۔ جو بات بھی اس کے سامنے بتاؤ اس کے ذہن کے پردے پر فیڈ ہوتی چلی جاتی ہے۔ میں کچھ بھول بھی جاؤں تو فوراً یاد دلائے گا۔ خالد میاں ان کے چچّا کے بارہ سال کے لڑکے ہیں۔ بڑے معصوم اور بھولے بھالے۔ ہمارا راحیل تو ان کے کان کاٹ لے اتنا تیز ہے۔ گاؤں سے پہلی بار باہر نکلے ہیں۔ شوق ہوا کہ بھائی کے پاس بمبئی جائیں گے۔ چچّا کی بھی دِلی خواہش تھی کہ خالد میاں شہر میں پڑھیں۔ خالد میاں پڑھنے میں کافی تیز ہیں۔

اسٹیشن پر میں ہی لینے گئی۔ ان کا تو دفتر کوسوں دُور ہے اسٹیشن سے۔ لیٹ

ہو جاتے، پھر بھول جانے کی عادت تب کیا ہوتا؟یوں بھی لوکل ٹرین میں سفر کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ جاتے جاتے میاں نے مجھے سو روپے پکڑا دیے۔ ''خالد میاں کو ٹیکسی سے لانا، بس میں ڈر نہ جائیں۔''

اے لو، میں کیا اتنا نہیں سمجھتی، بدھو ہیں میرے میاں۔ بھئی میں کیوں ننھے نادان کو بمبئ کی بس میں چڑھانے لگی۔ ان کو چڑھانے میں میں خود ہی چھوٹ گئی تو خالد میاں تو بھیڑ میں گم ہو جائیں گے۔ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ خالد میاں بمبئ میں رہنے والے اپنے گاؤں کے ہی ایک درزی کے ساتھ بھیجے گئے تھے۔ سفید چوڑی دار، گلابی شروانی، سر پر کلابتو کے کام کی ٹوپی لگائے وہ ایکدم شہزادے سے لگ رہے تھے۔ سفید ناگرا جوتا ان کے پیروں میں کاٹ رہا تھا بے چینی سے پیر جھٹک رہے تھے۔ سر حیرت سے گھما گھما کر اسٹیشن کی بھیڑ کا نظارہ کر رہے تھے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اتنے لوگوں کا سیلاب بھی تو پہلی بار دیکھ رہے ہوں گے۔ رنگ برنگے امام ضامن ان کے داہنے بازو پر بندھے بندھے ڈھیلے ہو چکے تھے۔ اب جھالر بن کر جھول رہے تھے۔ ہاتھ میں صدقے کا روپیہ تھامے وہ کسی کو دینے کی سوچ ہی رہے تھے کہ میں بھیڑ کو دھکیلتی ہوئی ان تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ مجھے دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی۔ میں گلے لگانے کو بڑھی تو وہ شرما کر ذرا کھسک گئے۔

''السلام علیکم حمیدہ اپیا۔'' میں اصغر کی خالہ زاد بہن بھی ہوں اس لیے سسرال میں مجھے کافی لوگ بھابھی نہ کہہ کر 'اپیا' ہی کہتے ہیں۔

''وعلیکم السلام۔'' میں نے ان کے ہاتھ سے جھولا لے لیا۔

''اصغر بھائی نہیں آئے؟'' انھوں نے جلدی سے پوچھا۔

''ان کو دفتر میں دیر ہو جاتی اس لیے میں ہی آ گئی۔''

''اپیا آپ کو اکیلے آتے ڈر نہیں لگا؟'' خالد میاں نے بے تحاشہ بھاگتی بھیڑ کو دیکھ کر کہا۔

''ڈر؟'' میں ہنس پڑی۔ میں نے سوچا پہلے بھیڑ بھاڑ دیکھ کر کیسے میرے جسم میں ایک سرد لہر سی دوڑ جاتی تھی۔ رگوں میں خون منجمد ہونے لگتا تھا۔ الہ آباد سے

نکل کر نئی بیاہ کر بمبئی آئی تھی۔ بھیڑ کا سمندر اور لوکل ٹرینوں وڈبل ڈیکر بسوں میں بیٹھنے کے تصور سے بھی کانپ اٹھتی تھی۔ اصغر کبھی گھومنے کا نام بھی لیتے تو میں گھر کے باہر نکلنے سے کتراتی۔ ایک یلغار ہر ایک سمت سے آوازوں کی......

ہر وقت ایک گھبراہٹ سی طاری رہتی۔ لیکن اب تو پندرہ سال گزر گئے ہیں۔ اس شور وغل کی عادت پڑ گئی ہے۔ بلکہ لمحہ بھر کو بھی یہ ہنگامہ خاموش ہو جائے تو دل ہولنے لگے گا کہ یا اللہ کیا قیامت آنے والی ہے؟

"اب اجازت دیجیے بی بی۔ آپ کی امانت حوالے کی۔" درزی صاحب نے اپنی راہ لی۔ میں نے خالد میاں کا ہلکا سا کانپتا ہوا ہاتھ تھام لیا اور بھیڑ میں شامل ہو گئی۔

جب ٹیکسی میں بیٹھ کر میں نے خالد میاں کو تیزی سے گزرتی بلڈنگیں دکھانی چاہیں تو وہ غنودگی میں آ چکے تھے۔ بے چارے نے اتنا لمبا سفر بھی تو پہلی بار کیا تھا۔ ٹریفک جام تھا، ٹیکسی رُک گئی، حبس ہو گیا۔ خالد میاں نے آنکھ کھول کر دیکھا۔ ہر طرف ٹیکسی ہی ٹیکسی کی بھیڑ...... وہ خوش ہو گئے۔ "حمیدہ اپیا...... یہاں صرف موٹریں ہی چلتی ہیں؟ تانگے اور فینس ناہیں؟"

ان کے گاؤں میں ابھی بھی بیبیاں ایک دوسرے کے محلّوں میں فینسوں سے جاتی آتی ہیں۔

"اتنا حبس ہے۔ یہاں ہوا بھی نہیں چلتی......" وہ کنمنائے۔ ان کی نگاہ دُور دُور تک درختوں کو تلاش کرتی رہی۔

"اپیا...... سب درخت کیا ہوئے؟"

"میاں...... بڑے شہروں میں درخت نہیں ہوتے بجلی کے تار اُلجھ جاتے ہیں نا...... ان کے گرنے سے حادثے بھی ہو جاتے ہیں اس لیے کاٹ دیے جاتے ہیں۔"

"پھر ہوا کیسے چلتی ہو گی؟" ان کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ سفید سفید بُھٹے جیسے دودھیا دانے والے دانت چمک اُٹھے۔ راحیل کے دانتوں میں تو کئی بار کیڑے لگ چکے ہیں۔ کم بخت نے ٹافی کھا کھا کر دانت چاکلیٹی رنگ کے کر لیے ہیں۔ کتنا منع کرو مانتا ہی نہیں شیطان۔ "خالد میاں...... یہ آپ کے دانت دودھ کے ہیں یا اصلی

والے؟"

خالد میاں جھینپ گئے۔ "اپیا ہمارے دانت تو دوبارہ نکلے ہیں۔ پرسال جب آپ لوگ آئے رہے تو ہم کڑھے نہیں رہے...... سب چڑاتے بھی تھے اصغر بھائی جان بھی۔"

ٹریفک جام سے ٹیکسی نکلی۔ سڑک پار سمندر کا نیلا ٹکڑا نظر آیا۔ میں نے خالد میاں کو انگلی کے اشارے سے دِکھایا۔

"وہ دیکھیے خالد میاں سمندر......"

"ارے...... یہ تو ہمارے دکن والے بڑے تالاب سے بھی بڑا ہے۔ واہ...... بھئی واہ......"

وہ خوش ہو گئے۔

ٹیکسی ڈرائیور نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور مسکرا دیا۔

ٹیکسی سے اتر کر میں نے بلڈنگ کا باہری نظارہ کرتے ہوئے خالد میاں کو بتایا۔

"اس زینت منزل میں تیس مالے ہیں۔"

"مالے؟"

"ارے مالے مطلب منزل...... فلور......"

"آپ کا مکان اوپر ہے؟"

"ہاں پچیسویں فلور پر ہے۔"

"لیکن ہم اتنی سیڑھیاں کیسے چڑھیں گے اپیا......؟" وہ روہانسے ہو گئے۔

"یہاں لفٹ ہے میاں۔"

"لفٹ کیا ہوتی ہے اپیا؟" ان کی آواز ڈری سہمی رہی۔

"لفٹ میاں لفٹ...... ایک مشین ہے ڈبّہ نما...... اسی میں بیٹھ کر ہم اوپر چلے جائیں گے۔"

"اُڑن کھٹولا جیسے؟" وہ چہکنے لگے۔ اِدھر اُدھر اُڑن کھٹولا جیسی کوئی چیز تلاش کرنے لگے۔

میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر لفٹ میں داخل کیا۔

پچیسویں فلور کا بٹن دبایا۔ لال بتی جلنے لگی۔ لفٹ میں اتفاق سے ہم دونوں ہی تھے۔ خالد میاں کو گھبراہٹ سی ہوئی۔ زمین سے اوپر اٹھنے کا احساس...... خلا میں لٹکے ہونے کا خوف...... گریوی ٹیشن (Gravitaion) سے دُور ہٹنے کا ڈر...... میرا ہاتھ کس کر انھوں نے پکڑ لیا۔ ان کا ہاتھ پسیج رہا تھا۔ ''ڈرو مت میاں۔'' پچیسواں مالا آگیا۔

لفٹ رُکی۔ دل کی دھڑکن رُک سی گئی۔ ایسا ہی مجھے بھی لگتا تھا۔ جب میں نئی نئی آئی تھی۔ آج لگا جیسے پھر پہلی بار لفٹ میں سوار ہوئی ہوں۔ ایک انجان سا احساس مجھے چھو کر گزر گیا۔ خالد میاں کود کر باہر نکلے۔ ان کے چہرے پر اطمینان جھلکا۔ جیسے کسی بڑی مصیبت سے چھٹکارا پایا ہو۔

سامنے سے گزرتی۔ منی اسکرٹ سے جھانکتی موٹی گداز رانوں کو دیکھ کر انھوں نے حیرت اور شرم سے منہ پھیر لیا اور دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوگئے۔

''لاحول ولا قوۃ۔'' وہ بڑبڑائے۔

''آیئے میاں۔'' میں نے فلیٹ کے انٹرلاک کی چابی لگائی۔ راکی بھونکنے لگا۔ بھونکنے کی آواز پر خالد میاں کے کان کھڑے ہوگئے۔ ''کُتا؟''

''ارے میاں راحیل نے پالا ہے۔ اس کے بغیر تو وہ ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتا۔ اٹھتا...... بیٹھتا...... کھاتا...... پیتا، سب اس کے ساتھ ہے۔'' میں بولتے ہوئے اندر چلی آئی۔ جوتوں کی چرمراہٹ باہر ہی رُک گئی۔

''ارے کیا ہوا؟'' اندر آیئے۔ راکی بندھا ہوا ہے؟''

''اپیا آپ لوگ کُتا پالے ہیں؟'' انھوں نے نہایت افسوس سے کہا۔ اس لمحے مجھے وہ ایک دَم چچّا نظر آئے۔

''کاٹتا نہیں ہے بڑا سیدھا ہے راکی۔''

''اپیا آپ لوگ شہر آکر ایک دَم شہراتی ہوگئے ہیں...... کُتا نجس ہوتا ہے۔ اس کا رُویاں بھی گھر میں پڑ جائے تو رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔ کیا آپ بھول گئیں؟'' ان کی آواز رقت سے کانپنے لگی۔

"ہاں...... ہاں خالد میاں...... آپ صحیح فرمارہے ہیں لیکن کیا کریں...... بمبئی میں فرشتے کیا شیطان بھی آتے ڈرتے ہیں۔ آپ اندر تو آیئے؟"

ڈیڑھ کمرے کے فلیٹ میں خالد میاں کی نظریں گھومتی رہیں۔ پھر ڈیڑھ بالشت کی بالکنی میں جاکر کھڑے ہوگئے۔

"اندر آؤ...... میاں چائے پیو۔"

"ہم چائے نہیں دودھ پیتے ہیں۔ وہ بھی خالص۔"

"اچھا کمرے میں تو آیئے۔"

"کمرہ...... اچھا ڈبہ...... یہ گھر کم ماچس کی ڈبیا زیادہ لگ رہا ہے۔ اپیا ہم تو سمجھتے تھے اصغر بھائی بڑے افسر ہیں۔ بڑا سا مکان ہوگا نوکر چاکر موٹر گاڑی سب کچھ...... جمیلہ خالہ کی بڑی حویلی جیسا......"

"یہاں تو نہ دالان ہے نہ ہی صحن...... ہوا بھی کیسے آتی ہوگی اور روشنی؟ آپ لوگ دن میں بھی بجلی جلاتے ہیں کیوں؟"

"میاں یہاں ہوا اور روشنی تو نعمت ہیں۔ بہت کم ہی فلیٹ میں پہنچتی ہے۔ رُخ ہی مکانوں کا ایسا ہوتا ہے......"

میں نے چائے اور کھارا بسکٹ میز پر رکھ دیا۔

چائے میں آدھا کپ دودھ اور ملا دیا۔ راحیل اور راکی بھی تو دودھ پیتے ہیں۔ سارا دُودھ خالد میاں کو ہی دے دیتی تو راحیل تو آتے ہی آفت کر دیتا۔

نل کھولا۔ پانی غائب...... بالٹی میں تھوڑا سا پانی تھا۔

"میاں منہ ہاتھ دھو کر آرام کرو......"

خالد میاں ابھی بھی بالکنی میں کھڑے تھے۔

دوسری بلڈنگ کے اوپری سرے پر دھوپ کا ایک ٹکڑا چمک رہا تھا۔

"اپیا...... یہاں بچے کھیلتے نہیں؟" انھوں نے دُور تک دیکھتے ہوئے سوال داغا۔

"یہاں بچے زیادہ تر گھروں کے اندر ہی کھیلتے ہیں۔ کمپیوٹر گیم وغیرہ...... باہر کم

ہی کھیلتے ہیں۔"

"کیا ابا نے کہا ہے کہ آپ ہمارا داخلہ یہاں کرا دیں بڑے مدرسے میں؟"

"ہاں کہا تو ہے...... لیکن تم کو بہت زیادہ محنت کرنا پڑے گی۔ یہاں داخلہ ملنا نہایت مشکل کام ہے......"

"تب تو ٹھیک ہے۔" وہ مطمئن ہو گئے۔ میز پر آ کر چائے کی رنگت دیکھی۔ انگلی ڈال کر پیالی میں سے چائے کی جھلّی اُتاری۔ بسکٹ بھگویا اور چپر چپر آواز کے ساتھ کھانے لگے۔

□□
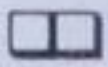
گنبدِ تیز گرِد نیلی فام

"اپنے موتی سوٗروں کے آگے مت ڈالو۔ ورنہ وہ ان کو سونگھ کر چھوڑ دیں گے اور پلٹ کر تم کو پھاڑ ڈالیں گے۔"

بائبل کا صفحہ اس نے تیزی سے پلٹا۔ اس کا دل کسی طرح قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ پاسپورٹ کی تفصیل کا کاغذ صفحے میں دب گیا تھا، اس نے نکالا۔ سیاہ لفظوں میں صاف صاف لکھا تھا۔

نام جیسمین بلموٹ

عمر ۳۲ سال

رنگت گہری سانولی

بال کالے

قد پانچ فٹ چار انچ

پہچان داہنے رُخسار پر سیاہ تل

پتہ ....

جیسمین بلموٹ کے سفری تھیلے میں بائبل کا نیا ٹسٹامنٹ ہمیشہ رہتا تھا۔ ان کے پاپا کا کہنا تھا کہ دُعائیں تمام بلاؤں سے محفوظ رکھتی ہیں۔ لیکن آج کوئی دعا کام نہیں آئی تھی۔ رب اعلیٰ۔ خدا باپ نے ان کی کوئی مدد نہیں کی۔ گھر سے نکلتے وقت پاپا ہمیشہ یہی دعا دیتے "خدا باپ اس بے ماں کی بچی کی مدد کرنا" وہ بے ساختہ ہنس پڑتی "پاپا تمھاری خونخوار لڑکی کی طرف کوئی بلا آتے ہوئے بھی ڈرتی ہے۔"

پاپا کی آنکھیں ساتویں آسمان پر خدا کو ڈھونڈنے لگتیں وہ زمین کے شیطانوں کو تلاش کرنے نکل پڑتی۔

پولیس کی نوکری ہی ایسی ہوتی ہے۔ اچھے اچھوں کو سخت جان بنا دیتی ہے۔ رات میں اس نے کئی بار اٹھ کر سوٹ کیس سے اپنی پستول نکالی۔ دیکھا پھر رکھ دیا۔ ہاتھ میں لیا۔ گولیاں گنیں اپنی کنپٹی تک پستول لے گئی۔ سوکھا چرخ تاڑ کے پیڑ سا لمبا—اس کا چہرہ مخصوص قہقہہ لگاتا ہوا نظر آیا۔ جی چاہا تڑسے گولی چلا دے اپنی کنپٹی پر۔ وہیل چیئر ڈھکیل کر پاپا سامنے آ کھڑے ہوئے۔ بوڑھے پاپا۔ جن کو وہ دل و جان سے چاہتی تھی۔ اکلوتا سہارا تھی ان کا۔ پاپا بھی پولیس کی نوکری میں تھے۔ ایک فرقہ وارانہ فساد میں اپنی دونوں ٹانگیں جوان بیوی اور بھائی کو گنوا چکے تھے۔ اس کے باوجود بے حد خوش مزاج، ہمت والے، مضبوط، زندہ دل، ہنس مکھ، کبھی زندگی سے مایوس نہیں ہوئے—وہ ان کی اکلوتی اولاد اتنی جلدی زندگی سے ناامید ہو گئی؟ ڈر گئی؟ ”نہیں—نہیں میں کیوں خودکشی کروں—میں نے کیا گناہ کیا ہے—اس گوئیے کو کیوں نہ مار دوں—تان سین کی اولاد کو—“ اس نے سوچا اور پستول پھر سوٹ کیس میں رکھ دیا۔

پاپا اس کی شکل دیکھ کر جیتے تھے۔ اس کی لاش دیکھ کر پاپا جیتے جی مر نہ جائیں۔ نہیں پاپا نہیں مر سکتے۔ پاپا کی موت کے بارے میں وہ سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔ جو انسان روز ہی چور سپاہی اور موت کا تماشا دیکھتا ہے وہ اپنوں کی موت کہاں برداشت کر پاتا ہے۔ کتنا کمزور ہو جاتا ہے دل—آہ—آج وہ ایسی پہلی رات تھی کہ جب وہ دورے پر تھی اور اس نے پاپا کو فون نہیں کیا تھا۔ ایک نیم بے ہوشی کے عالم میں تھی وہ—وہ کب ہوش میں آتی تھی اور کب بے ہوش ہو جاتی تھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس کو—نفرت اور تھکن ایک دوسرے پر حاوی ہوتی جا رہی تھیں۔ گیسٹ ہاؤس کے گیزر کا سوئچ آن، آف ہوتا رہا، ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی رہی اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

اس نے نہایت بے رحمی اور جنگلی پن سے اس کے ہونٹ چبا ڈالے تھے۔ اس

کے ہونٹ غیر قدرتی طور پر وزنی ہو گئے تھے۔ ان پر ننھی ننھی ریخیں پڑ گئیں تھیں۔ خون چھلک آیا تھا۔ دُھلے بھیگے بال نوچ ڈالے تھے۔ کلائیوں اور بازوؤں پر انگنت سرخ خراشیں پڑ گئی تھیں۔ جگہ جگہ پر اودے اور نیلے دھبے پڑ گئے تھے۔

کسمسا کر اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی۔ اس کی گرفت اور سخت ہو گئی۔ ہاتھ اس کے فولاد کی طرح بے رحم تھے۔ ایک ہاتھ اس نے منہ پر رکھ دیا۔ وہ چیخی لیکن اس نے اتنے زور سے ڈانٹا کہ اس کی سسکی حلق میں اتر گئی۔ پوری طاقت سے دور کرنا چاہا، اس نے تھپڑوں سے مارنا شروع کر دیا۔ طمانچہ اتنا غیر متوقع تھا کہ ششدر رہ گئی۔ اس کو بچپن سے لے کر آج تک کسی نے ہاتھ نہیں لگایا تھا گرم نگاہ تک سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ تتلی کے کیڑے کی طرح نرم روئی کے پھاہوں میں رکھ کر پالی گئی تھی۔

اس نے کبھی کسی سے ہاتھ تک نہیں ملایا تھا۔ وہ انسانی لمس سے غیر آشنا تھی ہمیشہ سلام کا جواب دور سے ہی دیتی کرسمس میں عورتوں تک کے گلے نہیں ملتی تھی اسے سخت الجھن ہوتی تھی ان چیزوں سے۔ ایک خاص دوری بنا کر رکھنے کی اس کی عادت تھی۔ کوئی پاس آنے کی جرأت بھی نہ کرتا۔ جن لوگوں نے کوشش کی بھی ان سے وہ اتنی بُری طرح پیش آئی کہ آئندہ کسی کی ہمت ہی نہیں ہوئی آگے بڑھنے کی۔ کتنے مزے سے وہ اپنے خول میں آرام سے بیٹھی تھیں۔ کس قدر محفوظ تھیں اپنے قلعہ کے اندر بی بی جیسمن۔

ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان کو کوئی چھو بھی سکتا ہے۔ گاڈ گریس (God grace) وہ کانپ اٹھیں — طالب علمی کے زمانے میں بھی کبھی کوئی نازک جذبہ نہیں اُبھرا۔ اور ابھرا بھی تو انھوں نے اس کو سختی سے کچل دیا۔ وہ کمزور جذبات کی قائل ہی نہیں تھیں مسلسل جد و جہد نے ان کو خشک مزاج بنا دیا تھا۔ وہ ایک لمحے کو بھی چاچا اور ممّا کی موت کو نہیں بھولی تھیں اور نہ ہی بھولنا چاہتی تھیں۔ اکثر وہ لاشعوری طور پر بے رحم ہو جاتیں۔

اگلی صبح جب وہ جی بھر کر رو دھو کر باتھ روم سے نکلیں تو سامنے میز پر چائے کی

ٹرے صبح کے تازہ اخبار کے ساتھ رکھی تھی۔ تمام رات کی بیداری اور شدید تھکان کے بعد ان کی خواہش چائے پینے کی ہوئی۔ مجبوراً چائے بنانے کے لیے ٹی کوزی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ گوپے نے ہاتھ بڑھا کر ہلکے سے چھولیا۔ اس نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا۔ غصے کے مارے اس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ چائے بن کر پیالی اس تک آگئی وہ نظریں نہیں اٹھا پا رہی تھی۔ اس نے اخبار اٹھا کر اس کی گود میں رکھ دیا اور خود اٹھ کر کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر سگریٹ پینے لگا۔

اس نے اپنی انگلیوں کو سونگھا۔ تیز بُو سگریٹ کی آرہی تھی۔ سگریٹ سے اسے شدید نفرت تھی۔ امپورٹیڈ خوشبودار صابن سے گھنٹوں ہاتھ دھوتی رہی۔ مگر — گلابی تولیہ سے پونچھ کر سونگھا تو لگ رہا تھا پانچوں انگلیاں جلتی ہوئی سگریٹ بن گئی ہیں۔

وہ سر پکڑ کر باتھ روم میں ہی بیٹھ گئی۔ باہر سے اس نے دروازہ کھٹ کھٹایا۔ خواہ مخواہ اس نے واش بیسن کا نل کھول دیا۔ دیر تک پانی کی آواز باہر جاتی رہی۔ تھوڑی دیر میں پھر دروازے پر دستک —— مجبوراً اس کو باہر آنا پڑا۔

"آپ کو میٹنگ میں پریس کلب جانا ہے" وہ پیٹھ موڑے کھڑا تھا۔ نیلی سفید دھاریوں والی قمیض چمک رہی تھی۔ اس کا سانولا رنگ تانبے کی رنگت کا ہو رہا تھا۔ جھٹکے سے ہینڈ بیگ اٹھایا اور وہ کمرے کے باہر آگئی۔ اس کی سوجی آنکھیں ڈرائیور نے حیرت سے دیکھیں "سخت مزاج میڈم آج ——" بیگ کھول کر سیاہ چشمہ چڑھالیا —— ڈرائیور کو راستہ بتانا تھا وہ ڈر رہی تھی کہیں اس کی آواز نہ کانپ جائے۔ وہ مشکل سمجھ گیا۔ موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس نے راستہ بتانا شروع کیا۔ وہی پراسرار آواز —— یہی آواز تو اس کی کمزوری تھی۔ ریڈیو اسٹیشن پر اس کی آواز ہی سن کر تو ٹھہر گئی تھی۔ عشق تھا اس کو خوبصورت آوازوں سے۔ شائستہ لہجہ۔ جب کہ وہ خود جنگلی زبان بولتی تھی۔ رہتی بھی تو جنگلی زبان والوں کے ساتھ تھی۔

اب یاد آرہا ہے کہ غزل سنانے کے لیے ہی تو پہلی بار اس کو بلایا تھا۔ پولیس ویک پارٹی میں وہی اس کو لائی تھی۔ ڈنر کے بعد کافی پینے کمرے میں بلایا تھا۔ اقبال

اسے بے حد پسند تھے۔ اُردو زبان پر بھی وہ اتنی ہی قادر تھی جتنا کہ کوئی اپنی مادری زبان پر ہو سکتا ہے۔ ''مسجد قرطبہ'' کی فرمائش کی تھی۔

''بڑی پسند ہے آپ کی، میں غالب کی غزل سناؤں گا۔''

''جی نہیں — غزل آپ میری پسند کی گائیں گے۔'' اس کا انداز تحکمانہ ہو گیا۔

نہیں سننے کی اس کو عادت ہی نہیں تھی۔ اپنی پوسٹ اور علم کا اس کو بے حد غرور تھا۔ اقتدار کا نشہ اس قدر طاری تھا کہ زندگی کے باقی پہلو دیکھنے کا موقع ہی نہیں تھا۔

بڑی دل آویز — نفیس اور پر سکون سی دھن گونجنے لگی۔ اس نے دھیرے سے آنکھوں کو بند کر لیا (یہی وہ منحوس لمحہ تھا) کمرے میں آواز جادو بن کر چھا چکی تھی۔

دبیز پردے شیشے کی لمبی کھڑکیوں کو ڈھکے ہوئے تھے وہ کب اٹھا۔ اس پر جھکا۔ اس کو ہوش آیا تو وہ مزے سے سگریٹ پی رہا تھا۔ اور اس کو گھور رہا تھا۔ ایک دم وحشی آنکھیں — جانور کا شکار کرنے کے لیے جو سرچ لائٹ پھینکی جاتی ہے ویسی ہی سرخی مائل چھوٹی، چھوٹی تیز آنکھیں۔ اس کے اندر کی تمام قوت اچانک ختم ہو گئی۔ وہ اٹھنے میں لڑکھڑا گئی۔ ننس (Nuns) سے وہ بے حد متاثر تھی۔ کرسچین کالج کا اس پر خاصہ اثر تھا۔ ورجن — ورجینٹی — مریم کی طرح پاک — ان تمام لفظوں پر اب پانی پھر چکا تھا۔

مرد — کمبخت مرد — ذلیل و خوار — وہ مردوں میں صرف اپنے پاپا کو چاہتی تھی باقی تمام مرد بے مروت اور قابل نفرت جھوٹے و مکار لگتے۔ عورتوں کو جلانے اور ستانے والے۔

اس کے پاس عورتیں آتی تھیں۔ ناک بہاتے بچے سینے سے چپکائے۔ روتی — کلپتی — پھولے ہوئے پیٹ لیے — اپنے پتی دیو کے لیے چھمایا چنا مانگتی جو قتل یا ریپ کے الزام میں جیل میں حرام کی روٹیاں توڑ رہے ہوتے اور اگلے جرم کے خواب دیکھ رہے ہوتے۔

بعض وقت وہ سوچتی خدا نے عورتوں کو اتنے آنسو کیوں دے دیے؟ ہر وقت

برسات۔ وہ خوش ہوتی ہیں تو آنسو آ جاتے ہیں، دُکھ میں بھی سکھ میں بھی ـــــ یہی ان کا سرمایہ ہے کیا؟ لیکن آج وہ اسی برسات میں خود ڈوب رہی تھی ابھر رہی تھی۔

ڈسپرین کی دو گولیاں اس نے گلاس میں ڈالیں۔ دھیرے دھیرے وہ گھلنے لگیں۔ پانی میں سفید بادل سے اٹھنے لگے۔ گرم ٹوسٹ پہ لگا نمکین مکھن اس کے زخمی ہونٹوں پہ جلنے لگا۔ اس کے منہ سے بے اختیار سی نکل گئی۔ جھنجھلاہٹ میں کنپٹی کو دبایا۔

گویئے کا سخت ہاتھ اس کی کنپٹی کے قریب آگیا۔ اس نے ہٹانا چاہا۔ انگلیاں مضبوطی سے جم گئیں۔ وہ نڈھال کرسی پر پڑی رہی۔ اس کا سر وہ سہلاتا رہا۔ خواب آور غنودگی اس پر غالب آگئی۔ نرمی سے اس کے گرم ہونٹوں نے پیشانی چوم لی۔ آنکھ کھلی --- پورے کمرے میں اس کی تیز مہک تھی۔ وہ کمرے سے جا چکا تھا۔ تھوڑی دیر وہ ساکت و جامد کھڑی رہی۔ یک لخت اسے لگا وہ اسے شدت سے چاہنے لگی ہے (لغو ـــ)

اگلے دن اتوار تھا۔ اس نے سوچا وہ چرچ جا سکتی ہے (کنفیشن کے لیے ـــ؟)

مومی شمع روشن کرتے وقت اس نے چپکے سے ماں مریم سے معافی مانگ لی۔ (میرے اس اکلوتے گناہ کو بخش دینا ماں میری) اس کی اکلوتی پھوپھی ہر سال امریکہ سے آتیں تو نصیحتوں کا ٹوکرا بھی ساتھ لاتیں۔ ٹوتھ برش کتنی بار کرنا چاہیے سے لے کر کیا رنگ پہننا چاہیے فیصلہ ان کا ہی رہتا۔ کتنا آسان رہتا ہے دوسرا فیصلہ لیتا رہے آپ اس راہ پر آرام سے چلتے رہیے۔ سوچنے کی بھی زحمت نہیں کریے ـــ پاپا اور پھوپھی نے اس کو ذہنی طور پر بالغ ہی نہیں ہونے دیا۔ ہمیشہ بچوں کی طرح سلوک کیا۔ اور اس کو اس کی عادت پڑ گئی۔

اس کے وجود میں سنسکار کی کیلیں اتنے اندر تک ٹھوک دی گئیں کہ وہ چاہ کر بھی کسی کو چاہ نہیں سکتی تھی۔

گھر واپس آکر وہ بستر پر چپ چاپ پڑی رہی۔ پاپا پریشان تھے اس بار ٹور سے واپس آکر ہر بار کی طرح وہ کوئی قصہ نہیں سنا رہی۔ کتنے گنہگاروں کو پکڑا۔ کیسے پکڑا

اور بہادری کے نئے کارنامے کیا انجام دیے۔ کچھ نہیں بتا رہی تھی۔ اس طرح تو کبھی نہیں ہوا آج تک ——

وہ لیٹے لیٹے سوچتی رہی کہ کیا واقعی حوّا نے آدم کو گیہوں یا سیب کھلانے کے لیے ورغلایا تھا —— بھلا حوّا کے اندر اتنی ہمت کہاں سے آئی ہوگی؟ یقیناً آدم نے حوّا کو کھلایا ہوگا۔ اکثر روایات غلط بھی تو ثابت ہو جاتی ہیں۔

اس کے لمس کا جادو اس پر چھا گیا تھا اور پھن کاڑھے جنگلی خواہشات کا ریلا بہالے جانے کو اتارو تھا اور اس کے تمام ہتھیار کند ہو چکے تھے۔

اچانک ایک قد آور عورت ان کے تہہ خانے سے نکل کر لڑنے لگی۔ وہ حیران رہ گئی۔

"کون ہو تم؟"

وہ سر اٹھائے ڈھیٹ کی طرح اکڑی کھڑی رہی "تمھارے اندر کی عورت" سخت لہجہ تھا اس کا۔

"جھوٹ ہے یہ، میرے اندر کوئی عورت نہیں ہے —— میں —— میں خود بڑا صاحب ہوں —— جانتی نہیں مجھے تم —— پچاس لوگ مجھے سلام کرتے ہیں —— میں کمزور بزدل عورت نہیں ہوں ——"

وہ ہنسی —— ایک خوفناک ہنسی جیسے حقیقت ہنسی —— سچ ہنسا ——

"مت مانو —— مت مانو —— لیکن ایک نہ ایک دن تمھارے شرم و حیا کے یہ پتھر جو تم نے مار مار کر مجھے لہولہان کر دیا ہے —— تم پر ہی بھاری پڑ جائیں گے ——"

نفرت اور غصّے سے وہ کانپ اٹھی ——

"چل نکل —— چل —— نکل —— بھاگ ——" عورت زور سے قہقہہ مار کر ہنسی اور تہہ خانوں کے اندھیروں میں جا کر چھپ گئی۔

رات کو پاپا کے لیے کافی بنا کر وہ ان کے کمرے میں لے گئی۔ خود کرسی پر بیٹھ کر انڈیا ٹوڈے پڑھنے لگی۔ پاپا نے کپ اٹھایا۔ سپ کیا پھر اس کو حیرت سے دیکھا کتاب کا ایک ورق بھی اتنی دیر میں نہیں پلٹا گیا تھا۔

"بیٹے۔"

"یس پاپا" اس نے آواز کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔

"نمکین کافی بنائی ہے؟"

"او— آئی ایم ساری پاپا— غلطی سے شکر کی جگہ نمک—"

"کوئی بات نہیں — ویسے بیٹا ہری نے ہر ڈبہ پر لیبل لگا دیا ہے شکر— نمک—"

"لایئے دوسری بنا دیتی ہوں۔" وہ جلدی سے اٹھی—

"ریلیکس (Ralax) بیٹے" انھوں نے وہیل چیر پاس کر لی اس کے۔ غور سے اس کا سُتا بجھا چہرہ دیکھا وہ سہم گئے—

"میری بچی" بے اختیار ہو کر انھوں نے اس کو اپنے قریب کر لیا۔

"پاپا" اس نے تھکا ہوا سر ان کے سینے پر ٹکا دیا— اس کا دل جو صدمے اور مصائب سہتے سہتے سخت ہو چکا تھا یک موم سا پگھل گیا۔

تمام رات اس کو تیز بخار رہا۔ سرسام کی سی کیفیت، مرد بھی اتنا خوبصورت ہوتا ہے یہ اس کو معلوم نہیں تھا۔ اس کو تو معلوم تھا کہ عورت کا جسم حسین ہوتا ہے۔ اس کی نمائش کی جاتی ہے۔ لیکن اس کا جسم چاقو کے تیز پھل کی طرح لمبا اور دھاردار تھا— رقاص کی طرح— سڈول— گٹھا ہوا— سخت— نرم— مضبوط— او خدا وہ لہرایا اور لگا کہ فضا کا بگل بج اٹھا— مور کا رقص شروع ہو گیا— اس کے پیر مور کی طرح بدصورت تھے، لیکن باقی حصہ— وہ مور میں تبدیل ہونے لگا— دھیرے— دھیرے— اپنے ست رنگے قوس قزح کے رنگوں میں رنگے پروں کو پھیلانے لگا— مور ناچ اٹھا— چاروں دشائیں ناچ اٹھیں— رقص تیز ہونے لگا— اور تیز— اور تیز— تانڈو نرت شروع— ارے یہ تو شنکر بھگوان ساکچھات کھڑے ہیں۔ نٹ راج کی مورتی سول لائنز الہ آباد کے کسی شوروم میں دیکھی تھی آج وہ سامنے کھڑی ہے۔

اڑیسہ کے لنگ راج مندر میں شیولنگ کو دودھ سے نہلایا جا رہا ہے— گپھا

میں اندھیرا ہے — پیروں کے نیچے دودھ آرہا ہے — پیر آگے نہیں بڑھ پارہے ہیں — دودھ کی ایک ندی ہے — شہد کی دوسری ندی ہے — پیر چپک رہے ہیں —

ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔ جنت میں دودھ اور شہد کی ندیاں بہتی ہیں — کیا جنت میں داخلہ مل گیا ہے —؟

آدم حوّا سے کہہ رہے ہیں — لو یہ سیب کھالو — یہ مزیدار ہے خوشبودار ہے رس بھرا ہے — لو — لو — لو — چکھو — نہیں — نہیں — نہیں — ماں مریم مجھے بچالو — سانس رکی جارہی ہے — بڑی گھٹن ہے -- فضا میں سگریٹ کا دھواں ہے — لو سیب کھالو — سیب شہد اور دودھ کی تیز خوشبو ہے — سرخ چرچ کی بلڈنگ میں گھنٹیاں بجتی چلی جارہی ہیں — سر پھٹا جارہا ہے — منہ میں شہد بھرا ہوا ہے — پنچ مڑی کے جنگلوں میں ایک آدی واسی عورت نے درخت سے چھتا توڑ کر تازہ تازہ شہد کھلایا تھا — وہی مزا — وہی خوشبو آج بھی — وہ گھبرا کر اٹھ گئی — صبح کی کرنیں کمرے میں آچکی تھیں — منہ میں شہد بھرا تھا۔ اس نے چائے نہیں پی۔

پالیکا بازار سے گزرتے ہوئے پاپا کے لیے چاکلیٹی اور گرے دو گرم قمیضیں خریدی تھیں۔ اس نے گلابی شیفان کی ساڑی لی تھی شاید اپنی بیوی کے لیے۔ وہ ساڑی نہیں پہنتی تھی۔ رات کو سوٹ کیس کھول کر اس نے پاپا کی قمیضیں نکالیں نیچے کی تہہ میں سے گلابی ساڑی جھانکی۔ اس نے ساڑی اٹھا کر پلنگ کے نیچے پھینک دی۔

"تمھارا ریڈیو سے کانٹریکٹ لیٹر آیا ہے۔" پاپا کمرے کے دروازے تک آگئے۔ اگلے دن اس کی ریڈیو ٹاک تھی۔ نہا کر نکلی تو سوٹ نکالتے نکالتے الماری میں اس کو گلابی ساڑی نظر آگئی نوکرانی نے غلطی سے ٹانگ دی تھی شاید۔

بال سلجھاتے ہوئے اس نے عرصے کے بعد اپنا چہرہ آئینے میں غور سے دیکھا۔ کم از کم ایک لپ اسٹک اور کولڈ کریم خرید لینا چاہیے۔

واقعی محبت عورت میں بازارو پن پیدا کر دیتی ہے۔ اس نے چڑھ کر کنگھے سے الجھے بالوں کو بری طرح نوچ ڈالا۔

باہر نکلی تو وہ گلابی ساڑی پہنے تھی۔ پاپا لان سے مسکرائے۔ اس نے ہاتھ ہلایا اور جاکر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس کو اچھی طرح معلوم تھا ریڈیو اسٹیشن کے — میوزک سکشن میں وہ بیٹھا کسی ٹین ایجر حسینہ کی کمر میں ہاتھ ڈالے راگ باگیشوری کے نشیب و فراز بتا رہا ہوگا۔

ریڈیو اسٹیشن کی شکستہ چہار دیواری کے جنگلے کے اوپر لگے ہوئے نوکیلے آہنی خاروں کے درمیان ڈیزی کے سفید نازک پھول لہلہا رہے تھے۔

بیگم اختر کا ریکارڈ بجے چلا جا رہا تھا — "عشق میں رہبر و رہزن نہیں دیکھے جاتے — عشق میں —"

□
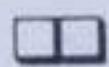
مشتِ خاک

اطہر میاں کے ابا گزشتہ نصف صدی سے گاؤں کے پردھان بنتے چلے آرہے تھے۔ اطہر میاں نے بھی بچپن سے لے کر جوانی تک یہی دیکھا کہ ابا ہی پردھان رہے۔ شاید بہت پہلے الیکشن کا چکر ہی نہیں رہتا تھا لہٰذا وہی جیت جاتے تھے۔ زمیندار جو تھے اس گاؤں کے۔ وہ بھی اکلوتے زمیندار۔ لیکن نیک اور ایماندار، کبھی کوئی غلط فائدہ نہیں لیا۔ ان کے تایا کے لڑکے چھوٹے ابا کہے جاتے وہ سرپنچ بنتے۔

ساری خدائی ایک طرف اور بڑے چھوٹے بھیوں کی بات ایک طرف۔ چھوٹے موٹے جھگڑے ہوتے اور آپس میں ہی نپٹ جاتے۔

لیکن گاؤں کی ہوا کب تک گرم نہ ہوتی۔ آخر اوروں کے لڑکے بالے بھی شہروں میں پل رہے تھے۔ چھوٹی قوموں کے چھوٹے بڑے لڑکے کانپور، احمد آباد، بمبئی، کلکتہ تک مزدوری کرنے جاتے اور برسوں وہاں جدوجہد کرتے رہتے۔ روٹی روزی کا مسئلہ حل ہونے کے بعد عید بقرعید کے موقع پر لوٹتے تو کپڑے لتے لے کر۔ چھوٹے چھوٹے گھروں میں خوشیاں چھا جاتیں۔ بچوں کی ریل پیل میں سے بڑھتی پودھ والے لونڈوں کو ساتھ لے جاتے وہاں جوتا بنانے سے لے کر درزی گیری جو بھی کام آسانی سے مل جاتا، سکھاتے۔ اس بار رام لعل کا لونڈا گرمی کے موسم میں جو پلٹا تو اس کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ گرم نیا خون جوش مار رہا تھا۔ الیکشن آتے ہی جھٹ پرچہ نامزدگی داخل کر دیا اور کھڑا ہو گیا اطہر میاں کے ابا کے مقابلے میں۔ ساتوں پُروں میں ہلچل مچ گئی۔ اطہر میاں کے ابا بھی گھبرائے۔ چھوٹے ابا نے تو

جوتا اُتار لیا۔ پر پٹھا بیٹھا نہیں۔ صلاح و مشورہ سب ہوا۔ پر پٹھا بیٹھا نہیں۔ ڈر تھا کہ ووٹ بٹ نہ جائیں۔ یوں جیتے اطہر میاں کے ابا ہی۔ چاہے مروّت میں ہی سہی لوگوں نے ووٹ ڈال دیے۔

اطہر میاں کے ابا بھی کب تک جیے جاتے۔ کوئی عمرِ خضر تو مانگ کر لائے نہیں تھے۔ اسّی کی عمر میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ فوراً چھوٹے ابا کے چھوٹے تیز طرار لڑکے نے گدّی پکڑ لی۔ اطہر میاں منہ تاکتے رہ گئے اور جم گئے مسند پر بجّن بھیا۔ ہاتھ میں کڑوا تیل پلایا لٹھ اور زبان بھی لٹھیتوں والی۔ اطہر میاں ٹھہرے شہری چوزے۔ وہ کہاں ٹک پاتے ان گھاگھوں کے سامنے۔ آم کا پرانا باغ ہاتھ سے نکل گیا۔ چوں نہ کی۔ کھیت کھلیاں میں بجّن میاں اپنا حصّہ بڑھانے لگے۔ اطہر میاں چپ۔ خاموشی سے گاؤں کے میڈیکل اسکول میں لڑکوں کو پڑھانے لگے۔

وقت بال سفید کرنے لگا۔ زمانہ کہاں سے کہاں تک دوڑ لگا گیا۔ سرکار نے عورتوں کو تیس فیصد ریزرویشن دے دیا۔ پنچایتی الیکشن شروع ہو گیا، لیکن اب کی دفعہ سیٹ ریزرو تھی لہٰذا کھڑی کی گئی پھلوا۔

پھلوا تو شرم سے سرخ ہو گئی جب بجّن بھیاؔ نے اس کو بلوا کر بتایا کہ "تو کھڑی ہو جا الیکشن میں۔ ہمارے لٹھیت تیرا ساتھ دیں گے۔ ایک بھی ووٹ اِدھر کا اُدھر نہیں ہونے دیں گے۔ اور ایسا نہیں کیا تو پھر سر پھٹول ہو گا......"

"نا ہی بھیاؔ۔" وہ پیر کے انگوٹھے سے چوپال کی کچّی زمین کھودنے لگی۔

"نا ہی کیا؟ گدّھی...... تیرے نام کا پرچہ بھرا دیا ہے تو انگوٹھا لگا دے بس...... پھر...... پھر چلانا کیسے ہے راج پاٹ یہ تو ہم بتائیں گے۔" وہ اپنی لال لال بھانگ کھائی آنکھوں سے پھلوا کو گھورنے لگے۔

"بھیاؔ ہم ایک گرہستی نہیں چلا پائے پورا گاؤں کیسے چلائیں گے؟" وہ روہانسی ہو گئی۔

"دھت تیرے کی پھلوا۔ توری عقل کبھو ٹھکانے رہے گی۔ اب انگوٹھا لگائے گی کہ ڈنڈا لگوا جائے۔" وہ اپنی تیل پلائی لاٹھی تولنے لگے۔

پھلوا پائل چھنکاتی بھاگ کھڑی ہوئی۔ تالاب کے کنارے جا کے رُکی۔

''نصیب بیٹی کہاں بھاگ رہی ہے؟''

خالد کی لماں نے گھرایا۔

خالد کی لماں ہیں دھوبن، گاؤں بھر کے کپڑے اسی پوکھر میں دھوتی ہیں۔ پھلوا ہے چھٹوا، کوری لوہار کی بٹیا۔ بچپن میں ایک بوڑھے سے بات طے ہو گئی۔ جب بارہ کی ہوئی تو گونا ہو گیا۔ جب پہنچی بوڑھے کے گاؤں۔ وہاں دیکھا بڑی بھاوج کا راج ہے۔ بوڑھا ان کے پیر دھو دھو کر پیتا ہے۔ بھائی اس کا شہر میں پڑا رہتا تھا۔ پھلوا سے ایک دن بھی نہ پٹی۔ بوڑھے نے سمجھایا پھر جوُتالات چلایا۔ پھلوا بھاگ کھڑی ہوئی۔ بڑی دَوڑ دُھوپ کی گئی۔ اطہر میاں کے ابا کے پاس مقدمہ پہنچا۔ سب سر جوڑ کے بیٹھے۔ پھلوا کو بلایا گیا۔ پھلوا منہ پھلائے بیٹھی رہی۔ سب سمجھاتے رہے اونچ نیچ بتائی گئی۔ زبردستی بھیج دینے کی بات بھی ہوئی۔

''ہم کنواں ماڈوب جاب مُل ہوّاں نہ جاب۔'' پھلوا کی موٹی موٹی کالی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ ہاتھ میں دبی کپڑے کی گڑیا نیچے گر پڑی۔ اطہر میاں کے ابا نے فیصلہ کر دیا۔

''پھلوا گاؤں میں ہی رہے گی۔''

کوری لوہار نے دہائی دی ''بڑے سرکار ہم گریب مَنئی (آدمی) ہیں، کہاں سے کھلائیں گے عمر بھر۔ بٹیا راجہ مہاراجہ نہ رکھ پائے، ہم کہاں رکھ پائیں گے۔''

بڑے سرکار بولے۔ ''کام ہماری ڈیوڑھی پر کرے گی پھلوا۔ کھائے گی بھی وہیں۔ اب بچی کو مرنے کے لیے تو سسرال بھیجا نہیں جا سکتا۔''

پھلوا جھٹ پٹ بھاگ کر تالاب کے کنارے چل دی۔ ایک ہاتھ سے گڑیا پکڑے دوسرے سے تالاب میں بے وجہ کنکریاں مارتی رہی۔ جنگلی بطخوں کا غول کنکری کی چوٹ کھا کر بار بار اپنا راستہ بدل دیتا۔

کوری لوہار چلاّتے رہتے۔ دو روٹی ڈال دے۔ پھلوا کی مرضی ہوتی تو پکاتی نہ مرضی ہوتی تو نہ پکاتی۔ یوں دن بھر کھیت جنگل ایک کر دیتی۔

"تو ہے تو لڑکا ہوئے کا چاہی۔ دن بھر مٹرگشتی۔" خالد کی اماں بڑبڑاتیں۔

بوڑھا آیا کئی بار۔ پھلوا گئی نہیں۔ یوں خوب سج دھج کر رہتی۔ میلا ٹھیلا سب کرتی۔ سر سدا گوندھا رہتا۔ خوشبودار تیل لگاتی۔ اطہر میاں کی گئوشالہ میں گائے بھینس کا سانی پانی کرتی۔ کھیت کھلیان سب کاٹتی، پیٹتی۔

برسات کی اندھیری رات میں کھیت میں مینڈھ باندھ آتی۔ نہر پھوٹ جاتی تو تختہ لگاتی۔ آم کے باغ میں رات دن جاگ کر پہرہ دیتی۔ گاؤں کی عورتیں طعنہ دینے سے باز نہ آتیں۔

"باپ کی چھاتی پر آ بیٹھی ہے مونگ دَلنے۔"

پھلوا جواب دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتی۔

"تو تمھری چھاتی پہ کاہے سانپ لوٹت ہے۔ تمھرے تو آدمی تمھری مٹھی میں بند ہیں نا کہ اُڑے جات ہیں۔"

اس کا کالا جامن سا رنگ دَمک اٹھتا۔ مجال جو کوئی لڑکا بالا بولی بول دے۔ ہاتھ پیر توڑ کے ایک کر دیتی۔ ہلدی چونا لگاتیں مائیں پھلوا کو کوستی رہ جاتیں۔

لیکن آج سجن بھیّا کی بات سن کر وہ سَن رہ گئی۔

"پردھان تو مَرد بنت ہیں، ہم تو عورت ہَن خالد کی اماں۔"

خالد کی اماں نے چٹکی لی۔ "تو کون مرد سے کم ہے پھلوا۔ پھڑوا جیسے ہاتھ پیر، جس پر مار دے کھڑے کھڑے گر جائے۔"

"گاؤں بھر سے تو ہم کا دُشمنی ہے۔ کون ووٹ دیہے؟"

"جیکا گرج ہوئے وہی دیہے اور کون دیہے۔"

خالد کی اماں کپڑے بچھا کر چل دیں۔ ناک بہاتا خالد کپڑے گھورے پہ پھیلانے لگا۔

خالد کا گدھا پھلوا کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

"تو ہم کا ووٹ دے ہے؟" پھلوا نے گدھے کی تھوتھن ہاتھ سے سہلاتے ہوئے پوچھا اور بھاگی کھیتوں کی طرف۔ بھاگتی گئی، بھاگتی گئی۔ جب گھاس چھیلتی چھبیلی،

نورا، ساوتری اور سوسما مل گئیں تو چلا پڑی۔

"اے سنوں ہمار گیوں (دوستوں) ہم الیکسن میں کھڑے ہوں گے۔" سب ایک ساتھ قہقہہ مار کر ہنس پڑیں۔

ووٹوں کی گنتی ہو گئی۔ پھلوا جیت گئی۔ بجن بھیا گیندے کے پھولوں کا ہار بنوا کر لائے۔

"اے پھلوا باہر نکل کر دیکھ بھیا جی آئے ہیں۔ سلام مار۔"

بجن بھیا کے مصاحب نے ہانک لگائی۔

پھلوا اپنی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی سے باہر نکلی۔ چھپر میں کھڑے مصاحب نے ہار بڑھایا۔ ہار لے کر اس نے پاس بنی بھینس کی ناند میں ڈال دیا۔ مصاحب کو گھورا۔

"اب ہم پہلے والی پھلوا نہیں ہَن جی کو جیسے چاہو پکارلو۔ جانو کہ ناہی؟ ناہی ہم تمھرے ہکائے پہ ہکے چلے والے جناور ہَن۔ اب ہم کو پردھان کہہ کر پکارو جانے کہ ناہیں؟"

بجن بھیا حیرت اور غصّے سے گھورتے رہے۔ مصاحب ہاتھ میں لٹھ لیے کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ پھلوا نے جا کر اطہر میاں کے پاؤں پر سر رکھ دیا۔

"سرکار ہم بڑے سرکار کے صدقہ میں جیت ہَن۔ آپ حکم دیں، ہم کلیجہ نکال کے دھر دیں۔ بڑے سرکار نہ چاہت تو ہم کب کی مر کھپ گئی ہوتیں، بڈھے کے گھر۔ سرکار کے کارن آج ہم جندہ ہیں۔ آج ہم نے جانا ہے کہ ہم ہو کچھ ہَن، عورت ہَن پیر کی جوتی ناہی کہ جب جی ما آوا بدل لیں۔ ہم کا بھی جینے کا حک ہے۔"

اطہر میاں برسوں بعد مسکرائے۔ پھلوا کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ابا کی آدم قد تصویر کو دیکھا اور ڈائری کا نیا صفحہ لکھنا شروع کیا۔

"شاید یہ تاریخ کا نیا کارنامہ ہے۔ پھلوا جیت گئی ابا۔" ان کا قلم خوشی سے کانپ رہا تھا۔

□□

شکنتلا

شفاف پانی سے بھرا حوض جس میں سنہری روپہلی ننھی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ سفید اور گلابی کنول کے پھول دھیرے دھیرے کھل رہے تھے۔ ان کے گول سبز پتوں پر پانی کی بوندیں ہیرے کی طرح چمک رہی تھیں۔

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔

خوشبودار پھولوں کی انگنت بیلیں جھول رہی تھیں۔ ایک لمحہ کو پانی میں شکنتلا کا عکس جھلملایا اور اس کی کھنکتی ہوئی ہنسی سے جنگل جاگ اٹھا۔

جھرنے بہنے لگے...... پھلوں نے درختوں کی ڈالیوں کو جھکا دیا۔

گہری نیند سے دُشینت جاگ اٹھا۔ اچانک اس کی نظر انگوٹھی پر پڑی...... ارے...... ابھی تو وہ شکنتلا کے ساتھ چہل قدمی کر رہا تھا...... جنگلی ہوا تھی ساتھ...... کہاں گئیں تم......؟

اس نے پی اے (P.A.) کو فون کھڑ کھڑایا۔

"ذرا فون نمبر بتانا شکنتلا کا......؟"

(نہ جانے بے چاری آشرم میں کیسی ہو گی؟ میں تو بھول ہی گیا الیکشن لڑنے کے چکر میں رہ گیا برسوں بیت گئے۔)

"سر!"

"یس۔"

"کس شکنتلا کا نمبر چاہیے؟"

"واٹ؟"

”سر جی...... میرا مطلب ورمالا شکنتلا ورما؟ سادھنا شکنتلا سوسودھیا؟ شکنتلا چودھری؟ ساگریکا شکنتلا آریہ؟ رومیلا شکنتلا بالئی والا؟

”کیا بک رہے ہو؟“

(شکنتلا...... تمھارا سرنیم کیا ہے پیاری...... جسٹ آئی فارگیٹ)

”سر! آپ کے کمپیوٹر میں کئی نمبر ہیں اس نام کے......“

”پیشے سے دیکھو تو ذرا......“

”ساگریکا ڈانسر ہے......“

”ورمالا جی ٹیچر......“

”رومیلا ٹرانسپورٹ کمپنی میں ہیں......“

”چودھری ہاؤس وائف ہیں......“

”سادھنا ٹائپسٹ ہیں......“

”دیکھو وہ آشرم میں رہتی تھی رشی جی کے...... ہرا بھرا جنگل تھا خوب گھنا...... دن میں بھی روشنی نہیں نظر آتی تھی اتنی ہریالی تھی...... وہاں میں ہرن کا شکار کرنے ہی تو گیا تھا......“

”کس اسٹیٹ کے جنگل میں سر؟“

”یاد نہیں آرہا اسٹیٹ کا نام......“

”سر، تمام جنگل کٹ چکے ہیں...... کالے ہرنوں کا شکار شہباز خان کر چکا ہے...... اور تمام سفید ہرنوں نے اس خوف سے خودکشی کر لی ہے کہ ان کا کوئی قتل نہ کر دے۔“

”ایڈیٹ۔“

”لیس سر۔“

”اچھا ۱۹۷ ٹیلی فون انکوائری سے پوچھو......“

”سر وہ ٹاپ ماڈل مادھوریما شکنتلم کا نمبر دے رہا ہے......؟“

”تو ٹھیک ہے وہی لے لو......!“

(یہی سہی......)

□

آتم کتھا

سلطان پور کے دُور افتادہ چھوٹے سے گاؤں میں، جہاں گنگا جمنی تہذیب آج بھی زندہ ہے، ایک پرانی روح نے نئے خول میں جنم لیا۔ زمیندار گھرانے میں میرانیسؔ کے مرثیوں نجم آفندی کے نوحوں، میرؔ اور غالبؔ کی غزلوں، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی و کرشن چندر کے افسانوں کی فضامیں بچپن گزرا۔

باجی، افسانہ نگار۔

بہنوئی، شاعر۔

ابا، داستان گوئی کے فن میں طاق۔

رام لیلا اور عرس میں شامل ہوتی آنکھیں 'رانی سارنگا' کے قصے۔ بچپن سے اب تک کہانیاں نظمیں، مضامین، ڈرامے اور سفر نامے لکھتی رہی۔ امرتا پریتم کے ناول ''ایک تھی سارہ'' کا اردو ترجمہ چند اور ترجمے۔ شہر الٰہ آباد میں اسکول سے میور کالج (یونیورسٹی) تک تعلیم ایم۔ ایس۔ سی (.M.Sc) نباتیات (Botany) قانون کی ڈگری اور اردو ادب میں ایم۔ اے۔ پونا فلم انسٹی ٹیوٹ سے فلم اپریسیشن۔ ہندی رسالہ 'منورما' کے شعبۂ ادارت سے وابستگی رہی۔ طویل عرصے تک آل انڈیا ریڈیو الٰہ آباد میں کیزوول اناؤنسر و ڈرامہ آرٹسٹ رہی، فی الحال محکمۂ اطلاعات و رابطہ عامہ اُترپردیش لکھنؤ میں فلم آفیسر۔ فطرت سے محبت و سیاحت کا جنون، گوتم بدھ کی طرح عرفان کی تلاش۔

رابطہ: 68۔ آفیسرس ہاسٹل میرا بائی مارگ، لکھنؤ۔226001 (یوپی)